سہ ماہی **بحث ونظر** حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۹۲-۹۳	اپریل — ستمبر ۲۰۱۳ء	جمادی الاولیٰ — شوال ۱۴۳۴ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِتعاون

اندرون ملک
ایک شمارہ:40روپے
سالانہ:150،بذریعہ رجسٹری:200
سہ سالہ:450،بذریعہ رجسٹری:550

بیرونِ ملک
ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر
یورپ،امریکہ،افریقہ کے لئے :
سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd, A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک / ڈرافٹ پرصرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''**العالم**'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر: 9959897621 91+

فہرست مضامین

افتتاحیہ

اس وقت عالم اسلام میں غیر معمولی کشمکش دیکھی جارہی ہے، مغربی دنیا نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام سے دور کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا ہے، تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو پوری قوت کے ساتھ گویا اس مقصد کے لئے وقف کردیا گیا ہے؛ لیکن اس کے باوجود عام مسلمانوں کے اندر اسلام سے وابستگی کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا ہے، اس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اور بہ ظاہر اس کو شریعتِ اسلامی کے اعجاز کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا، دنیا کے تمام مذاہب نے اس مذہب بیزار مہم کے سامنے ہتھیار ڈال دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو کچھ عباداتی رسوم تک محدود کرلیا ہے؛ لیکن مسلمان ایک ایسی اُمت ہیں، جو آج بھی زندگی کے تمام شعبوں میں احکام شریعت پر عمل آوری کو ضروری سمجھتے ہیں، چاہے عملی اعتبار سے ان کے اندر کوتاہی پائی جاتی ہو؛ لیکن فکری اور اعتقادی طور پر وہ اس کا یقین رکھتے ہیں، یہی بات ان لوگوں کے لئے حد درجہ باعث تشویش ہے، جو چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے مسائل میں مذہب کا کوئی دخل نہ ہو۔

مغربی طاقتوں نے مسلم ملکوں میں طویل عرصہ تک جو غاصبانہ حکمرانی کی اور استعمار کے ذریعہ عوام پر مسلط رہے، انھوں نے ہر جگہ ایک ایسے گروہ کو تیار کرلیا، جو ان کے جانے کے بعد بھی ان کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتے رہیں، یہ حقیقت میں منافقین ہیں، جو مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے ہیں؛ لیکن ان کے قلوب اسلام دشمن طاقتوں کے ساتھ ہیں، انھیں عوام کی مرضی کے برخلاف زبردستی حکمراں بنا کر مسلط کیا گیا اور عوام کو اپنی رائے اور مرضی کے مطابق حکمرانوں کے انتخاب سے محروم رکھا گیا، آخر جب غلامی کا یہ بوجھ عوام کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا اور انھوں نے اسے اُتار پھینکنے کی کوشش کی تو اول تو انھیں دہشت گرد اور انتہا پسند کا عنوان دے کر دبانے کی کوشش کی گئی اور اگر صبر وحکمت سے کام لیتے ہوئے حقیقی عوامی نمائندوں نے معرکۂ انتخاب کو سر کرلیا تو پھر ننگِ قوم فوجیوں اور ننگِ ملت خدا بیزار لبرل قوتوں نے ان کے خلاف سازشیں شروع کردیں، مصر میں سارے

دستوری اور اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر یہی کیا گیا، تیونس میں ایک جائز منتخب حکومت کے خلاف اسی طرح کی سازشیں کی جارہی ہیں، ترکی میں ایک جائز اور مقبول حکومت کے خلاف احتجاج جاری ہے، لیبیا میں ایک منصوبہ کے تحت ایسی تدبیر کی جارہی ہے کہ ''الاخوان المسلمون'' حکومت سے باہر ہو جائے، مغربی ذرائع ابلاغ کا حال یہ ہے کہ تیونس میں ایک لبرل گروپ کے لیڈر کا قتل ہو گیا تو طوفان کھڑا کر دیا گیا، ترکی میں احتجاجیوں پر پانی کی توپ داغی گئی تو اس کا افسانہ بنا دیا گیا؛ لیکن مصر میں سینکڑوں لوگوں کا قتل عام ہوا، مگر اس پر کوئی واویلا نہیں ہوئی، دوہرے معیارات نے مغرب کی جمہوریت پسندی کے کھوکھلے دعوے کو پوری طرح طشت از بام کر دیا ہے۔

عجب نہیں کہ ظلم و جور کی ان ہی سیاہ گھٹاؤں سے اسلام کی سربلندی کا سورج طلوع ہو، اس کی روشنی دشمنوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دے اور پھر تاریکیوں کے لئے منھ چھپانے کی کوئی جگہ باقی نہ رہے؛ کیوں کہ جیسے جیسے مغرب کا تشدد بڑھ رہا ہے، اسلام کی طرف مسلمانوں کی نئی نسل کی رغبت بھی بڑھتی جارہی ہے، ان حالات میں اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسلام کی دعوت کا مخاطب صرف عوام ہی کو نہ بنایا جائے؛ بلکہ جو بیوروکریٹس ہیں اور فوج —— جن کے ہاتھ میں ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور امن وامان کا قیام ہے —— ان پر خصوصی جدوجہد کی جائے اور ایک خاموش اور طویل العمل منصوبہ بندی کے ساتھ مسلمانوں کے تمام طبقات کو دین متین کی طرف لایا جائے؛ تاکہ اُمت میں کوئی ایسا طبقہ باقی نہ رہے، جس کو اسلام دشمن طاقتیں اپنا ہتھیار بنا سکیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر سکیں، بہ مقابلہ احتجاج کے دعوت کا راستہ طویل ہوتا ہے؛ لیکن اس کے اثرات دور رس اور ناقابل تسخیر ہوتے ہیں، آج تمام عرب ملکوں میں 'اخوان' کی جو مقبولیت حاصل ہے، اس نے وہاں کے جابر و غاصب حکمرانوں کی نیند اُڑا دی ہیں اور انھیں اپنی غیر قانونی حکومت اور عوام کی مرضی کے بغیر ان پر تسلط کے بارے میں خوف پیدا ہو گیا ہے۔

عالم اسلام میں جو تیز رفتار تبدیلیاں آرہی ہیں، ان کا ایک عبرتناک پہلو وہاں کے علماء کا کردار اور ان کی ضمیر فروشی ہے، مصر میں شیخ الازہر اور وہاں کے مفتی عام نے جس طرح کا بیان دیا اور سابق مفتی عام نے جس درجہ غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے فوجیوں کو مشتعل کیا، وہ علم کی تاریخ پر ایک بدنما داغ ہے، یہ اُمت اس سے پہلے بھی ایسے لوگوں سے داغدار ہوتی رہی ہے اور ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگوں نے اسلام کے نام پر اسلام سے بغاوت کو تقویت پہنچائی ہے، مصر کے علماء کا رویہ اور بالخصوص وہاں کے سلفی حضرات کی اسلام دشمن طاقتوں سے سازباز اسی کی ایک تازہ مثال ہے، علماء اور دینی کام کرنے والوں کی اس انداز پر تربیت ضروری ہے کہ وہ ہر قیمت پر اسلام کے وفادار

رہیں، نہ انھیں متاعِ خرید وفروحت بنایا جاسکے اور نہ جبر وتخویف کی تلوار ان کا قبلہ بدل سکے، جو لوگ اُمت کے مقتدا ہیں اور جن کی روشنی سے قوم اپنا راستہ دیکھتی ہے، اگر وہ بھی استقامت سے محروم ہوجائیں اور ان کی زندگی میں عزیمت کے لئے کوئی خانہ باقی نہ رہ جائے تو پھر کن لوگوں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کی کشتی کو بھنور سے نکال سکیں گے؟؟

وباللہ التوفیق وھو المستعان ۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹ر شوال ۱۴۳۴ھ
۶ر ستمبر ۲۰۱۳ء

○ ○ ○

ایک مدت بعد قابل ادائیگی دیون کی زکوٰۃ

خالدسیف اللہ رحمانی

زکوٰۃ واجب ہونے کی بنیادی شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ اموالِ زکوٰۃ کے مالک کو اپنے مال پر ملکیت تامہ حاصل ہو، ملکیت تامہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کا مالک بھی ہو اور اس مال میں تصرف کرنے کے موقف میں بھی ہو، تصرف کی صلاحیت کو بعض فقہاء نے ''قبضہ'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی اموالِ زکوٰۃ مالکان کی ملکیت میں بھی ہوں اور قبضہ میں بھی، یہیں سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک شخص کا کسی کے ذمہ دَین باقی ہو، خواہ یہ دَین قرض کی صورت میں ہو یا مالِ تجارت کی قیمت ہو، یا دَین کی کوئی اور شکل ہو، تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟— کیوں کہ ایک طرف وہ مال اس کے قبضہ میں نہیں ہے، اس لحاظ سے ''ملکیت تامہ'' حاصل نہیں ہے، دوسری جہت یہ ہے کہ وہ ازخود قبضہ سے دست بردار ہوا ہے اور اس مال پر قبضہ کے سلسلے میں مدیون کی حیثیت دائن کے وکیل و نائب کی ہے، اس لحاظ سے اسے اپنے مال پر 'ملکیت تامہ' حاصل ہے، پس ان دو مختلف جہتوں کی وجہ سے فقہاء نے یہ بحث کی ہے کہ دیون میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اور اگر واجب ہوگی تو کن دیون میں؟

جس دَین کے وصول ہونے کی توقع نہ ہو

اس سلسلے میں جمہور کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس دَین کے وصول ہونے کی توقع نہ ہو، مثلاً: مدیون لا پتہ ہو گیا ہو، دَین کا انکار نہیں کرتا ہو؛ مگر دیوالیہ ہو چکا ہو یا دَین کا انکار کرتا ہو اور گواہان موجود نہ ہوں، یا ہوں مگر ایسا ظالم شخص ہو کہ اس سے دَین کا مطالبہ کرنا دشوار ہو، تو ایسے دَین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؟ بعض فقہاء نے اسے ''مالِ ضمار'' سے تعبیر کیا ہے؛ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں مروی ہے کہ ان سے پہلے بنوامیہ کے ظالم بادشاہوں نے لوگوں سے ان کے جو مال ظلماً اور جبراً حاصل کئے تھے، آپ نے انھیں بیت المال سے واپس کرنے کا حکم دیا اور واپس کرتے ہوئے موجودہ سال کی زکوٰۃ لینے کا حکم دیا، پچھلے سالوں کی زکوٰۃ لینے سے منع فرمایا؛ کیوں کہ وہ 'مالِ ضمار' کے حکم میں تھا:

وتؤخذ زكاته لما مضى من السنين ثم عقب بعد ذلك بكتاب أن لا تؤخذ منه إلا زكاة واحدة فإنه كان ضماراً ۔ (۱)

گذرے ہوئے سالوں کی بھی زکوٰۃ لی جائے گی، پھر اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ ان سے صرف ایک ہی سال کی زکوٰۃ لی جائے؛ کیوں کہ ان کا مال ضمان کے درجہ میں تھا۔

یہ رائے امام ابوحنیفہؒ (۲) اور مالکیہ کی ہے: **قال مالك : يقوم المدير الدين من أرض وغيره إن كان يرتجيه وإن كان لا يرتجيه لم يقومه ،** (۳) شوافع کا ایک قول بھی یہی ہے، (۴) جب کہ امام ابو یوسف، امام محمدؒ (۵)، امام احمدؒ (۶) اور ایک قول کے مطابق امام شافعیؒ (۷) کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دَین کے وصول ہونے کی اُمید رہی ہو یا نہ رہی ہو، جب وصول ہوگیا تو گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جس کے وصول ہونے کی توقع ہو

جس دَین کے وصول ہونے کی توقع ہو، اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

حنفیہ :

حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کی رائیں مختلف ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دَین قوی میں زکوٰۃ واجب ہوگی، دَین صغیف میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور دَین متوسط کے سلسلے میں ایک قول زکوٰۃ کے واجب ہونے کا ہے اور ایک قول واجب نہ ہونے کا، علامہ علاء الدین کاسانیؒ نے دیون کی ان قسموں کی تعریف اور ان کے احکام کے سلسلے میں اس طرح وضاحت کی ہے :

أما القوى : فهو الذى وجب بدلا عن مال التجارة كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة وعبيد التجارة أو غلة مال التجارة ولا خلاف فى وجوب الزكاة فيه إلا أنه لا يخاطب بأداء شيئ من زكاة ما مضى مالم يقبض أربعين درهما فكلما قبض أربعين درهما أدى درهما واحدا وعند أبى يوسف و محمد كلما قبض شيئا يؤدى زكاته قلّ المقبوض أو كثر ۔

(۱) رواه مالک فی المؤطا۱۰۷۔ (۲) بدائع الصنائع:۲/۸۸۔
(۳) التاج والإكليل:۳/۵۵، نیز دیکھئے: منح الجليل:۳/۳۷۸۔
(۴) شرح المهذب:۶/۲۲۔ (۵) بدائع الصنائع:۲/۸۸۔
(۶) المغنى:۴/۲۶۹۔ (۷) المجموع:۶/۲۲۔

دین قوی وہ ہے جو مالِ تجارت کے بدلے واجب ہوا ہو، جیسے تجارتی سامان یعنی کپڑے، غلام یا مالِ تجارت میں اضافہ کی قیمت، اس میں زکوٰۃ واجب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں؛ البتہ گزرے ہوئے دنوں کا زکوٰۃ کے مخاطب اس وقت تک نہیں ہوں گے جب تک وہ چالیس درہم (نصاب کے پانچویں حصہ) پر قبضہ نہیں کرلیں، پھر جب چالیس درہم پر قبضہ حاصل ہوجائے تو وہ اس پر ایک درہم ادا کریں گے اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جتنا قبضہ کرتا جائے اس کی زکوٰۃ ادا کرتا جائے، چاہے قبضہ میں آنے والا عوض کم ہو یا زیادہ۔

وأما الدين الضعيف ، فهو الذى وجب له بد لا عن شيئ ، سواء وجب لـه بغير صنعه كالميراث أو بصنعه كالو صية أو وجب بدلا عما ليس بـمـال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن القصاص وبدل الكتابة ولا زكاة فيه مالم يقبض كله يحول عليه الحول بعد القبض . (۱)

اور دین ضعیف وہ ہے جو کسی چیز کے بدلے میں واجب ہوا ہو، چاہے اس میں انسان کے فعل کو دخل نہ ہو، جیسے میراث یا انسان کے فعل کو دخل ہو، جیسے وصیت یا وہ ایسی چیز کے بدلے میں واجب ہوا ہو، جیسے: مہر، بدل خلع، قصاص پر صلح کی رقم بدل کتابت، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جب تک پورے مال پر قبضہ نہ ہوجائے اور قبضہ کرنے کے بعد اس پر سال نہ گزر جائے۔

محیط برہانی میں بھی احناف کے مسلک کی بہتر طور پر توضیح کی گئی ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

يجب أن يعلم بأن من عليه الدين لا يخلوا إما أن يكون مقرا بالدين أو جـاحـدا لـه ، وإما أن يكون مليئا أو مفلسا ، فإن كان مليئا وكان مقرا بـالدين فلا يخلو إما أن وجب الدين بدلا عما هو مال التجارة كبدل الدراهم والدنانير وعروض التجارة وما أشبهه وهو الدين القوى ، أو وجـب بـدلا عما هو مال إلا أنه ليس للتجارة كثمن عبيد الخدمة وما أشبهـه وهو الدين الوسط ، أو وجب بدلا عما هو ليس بمال كالمهر والـدية وبـدل الـخـلـع والـصـلـح عن دم العمد وما أشبهه وهو الدين

(۱) بدائع الصنائع: ۲/ ۹۰۔

الضعيف ، وما وجب بدلا عما هو مال التجارة فحكمه عند أبي حنيفة أن يكون نصابا قبل القبض تجب فيه الزكاة ولكن لا يجب فيه الأداء مالم يقبض منه أربعين درهما ، وما وجب بدلا عما هو مال إلا أنه ليس للتجارة فحكمه في رواية عنه أنه لا يكون نصابا قبل القبض ، وعلى هذه الرواية اعتمد الكرخي ، وفي رواية الأصل عنه أن يكون نصابا قبل القبض يجب فيه الزكاة ولكن لا يجب فيه الأداء مالم يقبض منه مائتي درهم ، وما وجب بدلا عما ليس بمال فحكمه على قوله الأول أن يكون نصابا قبل القبض ، وعلى قوله الآخر لا يكون نصابا قبل القبض وهو الصحيح ، وقد فرق على قوله الآخر بينما وجب بدلا عما ليس بمال أصلا ، وفيما وجب بدلا عما هو مال ۔ (۱)

اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ جس شخص پر دین واجب ہو یا تو اس کو دین کا اقرار ہوگا یا وہ اس کا منکر ہوگا اور یا وہ مالدار ہوگا یا مفلس ہوگا، تو اگر مالدار ہے اور اسے دین کا اقرار ہے تو پھر یا تو یہ دین مالِ تجارت کے عوض واجب ہوا ہوگا، جیسے درہم و دینار، سامان تجارت اور اس طرح کی چیزوں کا بدل یہ دین قوی ہے، یا مال کے بدلہ میں تو واجب ہوگا، مگر مالِ تجارت کے بدلے میں نہیں ہوگا، جیسے: خدمت میں کے رکھے ہوئے غلام کی قیمت اور اس طرح کی دوسری چیزیں یہ دین وسط ہے، یا ایسی چیز کے بدلے میں واجب ہوگا جو مال نہیں ہے، جیسے: مہر، دیت، بدل خلع، قتل عمد میں صلح پرمبنی مال اور اس طرح کی دوسری صورتیں یہ دَین ضعیف ہے، تو جو دَین مالِ تجارت کے عوض میں واجب ہوا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا حکم یہ ہے کہ وہ قبضہ سے پہلے بھی نصاب ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہے؛ لیکن جب تک چالیس درہم تک قبضہ نہ ہو جائے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں اور جو دَین غیر تجارتی مال کی بنیاد پر واجب ہو تو امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے مطابق قبضہ سے پہلے وہ نصاب نہیں، امام کرخیؒ نے اس قول پر اعتماد کیا ہے اور کتاب الاصل کی روایت کے مطابق قبضہ سے پہلے بھی نصاب شمار کیا جائے گا اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی؛ لیکن جب تک دوسو درہم پر

(۱) المحیط البرهانی:۲۴۴/۳۔

قبضہ نہیں کیا زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی اور اگر دَین ایسی چیز کے بدلے واجب ہو جو مال نہیں ہے تو پہلے قول کے مطابق اس کا حکم یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی وہ نصاب ہے اور دوسرے قول کے مطابق قبضہ سے پہلے نصاب نہیں ہے اور یہی درست ہے اور اس دوسرے قول کے مطابق جب دین کسی مال کا عوض نہ ہو اور جب مال (غیر تجارتی ہو) کا عوض ہو تو دونوں کے درمیان فرق کیا جائے گا (یعنی پہلی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور دوسری صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی)۔

وأما الدين الوسط : فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة ، وفيه روايتان عنه ، ذكر في الأصل : أنه تجب فيه الزكاة قبل القبض ؛ لكن لا يخاطب بالأداء مالم يقبض مائتى درهم فإذا قبض مائتى درهم زكى لما مضى ، وروى ابن سماعة عن أبى يوسف عن أبى حنيفة أنه لا زكاة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو أصح الروايتين عنه ۔ (۱)

دَین وسط وہ ہے جو غیر تجارتی مال کے بدلے واجب ہو، جیسے خدمت کے لئے رکھے گئے غلام اور استعمال اور پہننے کے کپڑے اور اس کی قیمت، اس سلسلے میں امام ابوحنیفہ سے دو روایتیں منقول ہیں، کتاب الاصل میں ہے کہ اس میں قبضہ سے پہلے بھی زکوٰۃ واجب ہوگی ؛ لیکن جب تک دوسو درہم پر قبضہ نہ ہو جائے زکوٰۃ کے ادائیگی کے مخاطب نہیں ہوں گے، اگر دوسو درہم پر قبضہ ہو جائے تو وہ گذشتہ دنوں کی بھی زکوٰۃ ادا کریں گے اور ابن سماعہ نے بواسطہ امام ابو یوسفؒ امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ جب تک دوسو درہم پر قبضہ نہ ہو جائے اور قبضہ کے بعد اس پر سال نہ گزر جائے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، امام صاحب سے یہ روایت زیادہ صحیح ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے پیش نظر یہ ہے کہ جو دین مالِ تجارت کے بدلہ میں ہو، وہ بھی مالِ تجارت کے حکم میں ہے؛ اس لئے اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور جو دین مالِ تجارت کا عوض نہیں ہے؛ بلکہ کسی اور مال یا خدمت کا عوض ہے، اس کا درجہ اس سے کم ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع:۲/۹۰۔

امام ابو یوسف اور امام محمد ﷺ کے نزدیک بھی عاقلہ پر واجب ہونے والی دیت اور مال کتابت کے سوا تمام دیون میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے :

وقال أبويوسف و محمد : الديون كلها سواء وكلها قوية تجب الزكاة فيها قبل القبض إلا لدية على العاقلة ومال الكتابة فإنه لا تجب الزكاة فيها أصلا مالم تقبض ويحول عليها الحول ۔ (۱)

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ تمام دیون برابر ہیں اور سب کے سب قوی ہیں، ان میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب ہوگی ؛ البتہ عاقلہ پر واجب ہونے والی دیت اور مال کتابت مستثنیٰ ہیں کہ جب تک قبضہ نہ ہوجائے اور سال نہ گزر جائے ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

مالکیہ :

مالکیہ کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائیگی کے اعتبار سے دیون تین طرح کے ہیں، ایک: وہ جن میں ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی رہے گی، یہ حکم ''تاجر مدیر'' کے سامانِ تجارت کی واجب الاداء قیمت کے بارے میں ہے اور ''تاجر مدیر'' سے وہ تاجر مراد ہے، جو موجودہ قیمت میں خرید وفروخت کرتا ہو۔

دوسرے: وہ دَین ہے کہ دَین وصول ہونے کے بعد اس پر ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے —— یہ حکم قرض کے طور پر دیئے ہوئے دَین کے بارے میں اور ''تاجر محتکر'' کے دَین کے بارے میں ہے، تاجر محتکر سے وہ تاجر مراد ہے، جو سامان کو روک کر رکھتا ہو؛ تاکہ اسے زیادہ قیمت میں فروخت کرسکے، قریب قریب یہ وہی صورت ہے، جس کو امام ابوحنیفہ ﷺ نے 'دین قوی' سے تعبیر کیا ہے۔

تیسرے: وہ دَین ہے کہ وصول ہونے کے بعد جب سال گزر جائے، تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، جب تک وہ مدیون کے ذمہ ہے، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، جیسے: مہر، یا جنایت کا عوض وغیرہ، جس کو فقہاء حنفیہ نے 'دَین ضعیف' سے تعبیر کیا ہے۔(۲)

شوافع :

شوافع کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دَین مویشی یا خوردنی اشیاء کا ہو، تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، اس کے

---

(۱) بدائع الصنائع:۲/۹۰۔

(۲) مالکیہ کے مسلک کے لئے دیکھئے: التاج والاکلیل:۳/۵۵، منح الجلیل شرح مختصر الخلیل:۳/۳۷۸۔

علاوہ درہم و دینار یا سامانِ تجارت کے عوض جو دَین واجب ہو، اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی؛ البتہ زکوٰۃ کی ادائے گی دَین وصول ہونے کے بعد واجب ہوگی اور اس وقت وہ پوری مدت کی زکوٰۃ ادا کرے گا؛ البتہ بعض فقہاء شوافع کی رائے ہے کہ دَین مؤجل میں مطلق زکوٰۃ واجب نہیں، وصول ہونے کے بعد جب سال گذر جائے تب زکوٰۃ واجب ہے، یہ رائے ابوعلی بن ابی ہریرہ ؒ سے منقول ہے،(۱) یہی رائے صحابہ میں حضرت عائشہ ؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر ؓ اور بعد کے اہل علم میں عکرمہ ؒ سے بھی منقول ہے، (۲) علامہ نووی ؒ نے شوافع کی رائے کا خلاصہ اس طرح ذکر کیا ہے :

قال أصحابنا : الدين ثلا ثة أقسام : أحدها : غير لازم كمال الكتابة فلا زكاة فيه بلا خلاف لما ذكره المصنف ، الثانی : أن يكون لازما وهو ماشية ، بأن كان له فی ذمة إنسان أربعون شاة سلما أو قرضا فلا زكاة فيها أيضا بلا خلاف ؛ لأن شرط زكاة الماشية السوم ولا توصف التی فی الذمة بأنها سائمة ، الثالث : أن يكون دراهم أو دنانير أو عرض تجارة وهو مستقر ، ففيه قولان مشهوران ، القديم : لا تجب الزكاة فی الدين بحال لأنه غير معين ، والجديد الصحيح باتفاق الأصحاب وجوب الزكاة فی الدين علی الجملة ، وتفصيله أنه إن تعذر استيفائه لإعسار من عليه أو جحوده ولا بينة أو مطله أو غيبة فهو كالمغصوب ، وفی وجوب الزكاة فيه طرق تقدمت فی باب زكاة الماشية والصحيح وجوبها ۔ (۳)

ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ دَین کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جو لازم نہ ہو، جیسے مالِ تجارت، بالاتفاق اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ لازم ہو اور یہ چوپائے میں زکوٰۃ کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ اسے چراگاہ میں چرایا جاتا ہو اور جو جانور دوسروں کے ذمہ ہیں وہ سائمہ نہیں ہوسکتا، تیسری صورت یہ ہے کہ دَین درہم و دینار اور سامان ایسے تجارت کی صورت میں ہے جو قائم ہے، اس سلسلے میں دو مشہور قول ہیں: قولِ قدیم یہ ہے کہ دَین میں کسی مالِ زکوٰۃ میں واجب نہیں ہے؛

---

(۱) المهذب مع المجموع:۶/۲۰۔ (۲) المغنی:۴/۲۷۰۔

(۳) المجموع شرح المهذب:۷/۲۱، نیز دیکھئے: الحاوی للماوردی:۳/۲۶۳، تحفة المحتاج فی شرح المنهاج:۱۳/۱۹۔

اس لئے کہ وہ متعین نہیں اور صحیح قول جدید یہ ہے کہ ان سب پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس پر فقہاء شوافع کا اتفاق ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مدیون کی تنگدستی کی وجہ سے یا اس کے انکار یا گواہی فراہم نہ ہونے کی وجہ سے یا اس کے ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے یا اس کے غائب ہونے کی وجہ سے اگر دَین کا وصول کرنا دشوار ہو تو وہ مالِ مغصوب کے حکم میں ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلے میں کئی صورتیں ہیں، جانوروں کی زکوٰۃ کے سلسلے میں ان کا ذکر آچکا ہے، صحیح یہی ہے کہ ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حنابلہ :

حنابلہ کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کے دَین میں زکوٰۃ واجب ہوگی؛ البتہ زکوٰۃ کی ادائے گی دَین پر قبضہ کے بعد واجب ہوگی :

وجملة ذلک أن الدين على ضربين : أحدهما : دين على معترف به باذل له فعلى صاحبه زكاته إلا أنه لا يلزمه إخراجها حتى يقبضه فيؤدى لما مضٰى ، روى ذلک عن على رضى الله عنه ، وبهذا قال الثورى وأبوثور وأصحاب الرأى ۔ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ دَین کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ دَین جس کا مدیون کو اعتراف ہو اور وہ اس کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو صاحب دَین پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی؛ البتہ جب تک قبضہ نہ ہو جائے زکوٰۃ نکالنا واجب نہیں ہوگا، قبضہ کے بعد گزرے ہوئے دنوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی رائے نقل کی گئی ہے، سفیان ثوریؒ، ابوثورؒ، اصحابِ الرائے اس کے قائل ہیں۔

مذاہب کا خلاصہ

پس مذاہبِ اربعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(الف) جمہور کے نزدیک جس دین کی وصولی کی اُمید ختم ہوگئی ہو، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

(ب) مالِ تجارت کے عوض کے طور پر جو دَین باقی ہو، اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی؛ البتہ شوافع کے نزدیک مویشی اور خوردنی اشیاء میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

---

(۱) المغنی:۲۶۹/۴، نیز دیکھئے: الإنصاف فی معرفة الراجح من الخلاف:۲۱/۳، الشرح الکبیر لإبن قدامه:۴۴۳/۲۔

(ج) قرض کے طور پر جو دَین واجب ہو، اس میں بھی جمہور (حنفیہ، شوافع، حنابلہ) کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوگی ؛ مالکیہ کے یہاں وصول ہونے کے بعد صرف ایک سال کی واجب ہوگی، یہی نقطۂ نظر سعید بن مسیّب، عطاء بن ابی رباح، عطاء خراسانی اور ابوالزناد ؒ کا بھی ہے۔(۱)

(د) جو دَین مالِ تجارت کے عوض نہ ہو یا کسی خدمت کے عوض ہو، جمہور کے نزدیک اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

دَین حال

جہاں تک دَین مؤجل اور دَین حال کی بات ہے، تو اکثر فقہاء نے نفس وجوب میں ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا ہے، فرق اس بات میں کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا کب واجب ہے؟ امام ابوحنیفہ ؒ، تاجر مدیر کے دَین کی شکل میں امام مالک ؒ، راجح قول کے مطابق امام شافعی ؒ، نیز امام احمد بن حنبل ؒ کے نزدیک دَین مؤجل میں جب تک مال پر قبضہ نہیں ہوجائے، زکوٰۃ کی ادائے گی واجب نہیں ہوگی ؛ البتہ دَین پر قبضہ کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ واجب ہوگی، امام ابویوسف، امام محمد ؒ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی ؒ کے نزدیک قبضہ سے پہلے ہی دائن کے لئے اس کی زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب ہوگا ؛ کیوں کہ مدیون کا قبضہ دائن کے قبضہ کے حکم میں ہے 'بخلاف دَین حال کے' دَین حال میں اگر مدیون خوش حال ہو تو سبھوں کے نزدیک قبضہ سے پہلے ہی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوجائے گی، اس سلسلے میں علامہ ابن قدامہ ؒ کی یہ تحریر واضح ہے کہ :

> **وظاهر كلام أحمد أنه لا فرق بين الحال والمؤجل ؛ لأن البراءة تصح من المؤجل ولو لا أنه مملوك لم تصح البراءة منه لكن يكون في حكم الدين على المعسر لأنه لا يمكن قبضه في الحال ۔ (۲)**
>
> امام احمدؒ کے کلام سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دَین مال اور دَین مؤجل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے؛ اس لئے کہ دَین مؤجل سے بری کرنا معتبر ہوتا ہے، اگر وہ اس کی ملکیت نہ ہوتا تو اس سے بری کرنا درست نہیں ہوتا؛ لیکن وہ تنگدست شخص کے ذمہ واجب دَین کے حکم میں ہوتا ہے؛ اس لئے کہ فی الحال اس پر قبضہ کرنا ممکن نہیں۔

موجودہ عہد میں دَین مؤجل کی صورتیں

پہلے زمانہ میں دَین مؤجل کی صورت محدود اور سادہ نوعیت کی تھی، عام طور پر ضرورت مندوں ہی کو طویل

---

(۱) المغنی: ۲۷۰/۴۔ (۲) المغنی: ۲۷۱/۴۔

مدت کی سہولت پر قرض دیئے جاتے تھے، بیع مؤجل میں ثمن مشتری کے یہاں باقی ہوتی تھی، بیع سلم میں مبیع بائع کے یہاں باقی ہوتی تھی، معاملات کی یہ صورتیں عام طور پر سادہ طریقہ پر روزمرہ کی ضروریات کو پوری کرنے کے لئے ہوتی تھیں، استثمار کے طور پر ''تاجیل'' کا استعمال نہیں ہوتا تھا، موجودہ دور میں اسلامی مالیاتی اداروں نے بہت سے معاملات کو مؤجلا استثمار کے لئے استعمال کرنا شروع کیا ہے؛ اس لئے اس دور میں دیون مؤجلہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے، ان دیون سے مدیون کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کو کاروبار کے لئے رقم مل جاتی ہے اور کاروبار فروغ پاتا ہے، دوسری طرف دائن کو بھی نفع حاصل ہوتا ہے ـــــ اس طور پر دیون مؤجلہ کی چند مروجہ صورتیں یہ ہیں :

- فکس ڈپازٹ : ربوی بینکوں میں یہ طریقہ انٹرسٹ کے حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور افسوس کہ بہت سے مسلمان اس میں گرفتار ہیں، اسلامی بینکوں میں مضاربت، شرکت، یا وکالت بالاستثمار وغیرہ کے طریق پر رقم محفوظ کرائی جاتی ہے؛ تاکہ حلال طریقہ پر نفع حاصل کیا جائے۔
- باؤنڈز (سندات) کی صورت میں رقم مشغول کرنا : جس میں ایک مقررہ وقت میں متعینہ اضافہ کے ساتھ بینک یا کمپنی رقم واپس کرتی ہے، اگرچہ کہ یہ صورت انٹرسٹ کی ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے؛ لیکن اصل رقم جائز ہے، جو اس میں مشغول کی گئی ہے اور باؤنڈز جاری کرنے والوں کے ذمہ اس کی حیثیت دَین کی ہے۔
- اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں نے باؤنڈز کے متبادل کے طور پر ''صکوک'' کی صورت کو وجود بخشا ہے، یہ ''صکوک'' بھی بعض اوقات ایسے مالِ تجارت کی نمائندگی کرتے ہیں، جو دوسرے کے ذمہ دَین ہیں، جیسے :
- صکوک سلم : جس میں مبیع بائع کے ذمہ باقی ہوتی ہے۔
- صکوک استصناع : یہ بھی صانع کے ذمہ واجب الاداء مصنوعات کی نمائندگی کرتا ہے۔
- صکوک مضاربت یا صکوک مشارکت : مضارب اور شریک کے پاس موجود رأس المال کی نمائندگی کرتا ہے ـــــ اور سلم، استصناع، مضاربت اور شرکت کی مقررہ مدت پر قابل ادائے گی ہوتا ہے۔
- مرابحہ للآمر بالشراء : اس میں مبیع کی قیمت مشتری کے ذمہ دَین ہوتی ہے۔
- آج کل بعض اسلامی بینک ضرورت مندوں کو نقد سرمایہ فراہم کرنے کے لئے ''تورق'' کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، جس میں ایک شخص کوئی سامان خرید کر دوسرے سے کم قیمت میں اُدھار فروخت کردیتا ہے، اس میں بھی مشتری پر قیمت دَین مؤجل کی صورت میں واجب الاداء ہوتی ہے۔
- سلم : جس میں بائع پر مبیع دَین ہوتی ہے۔
- استصناع : جس میں مبیع بائع پر اور بعض اوقات ثمن کا کچھ حصہ مشتری پر دَین ہوتا ہے؛ کیوں کہ استصناع عقد کی ایک ایسی صورت ہے، جس میں فریقین کی طرف سے عوض ''دَین'' ہوسکتا ہے۔

○ انشورنس میں جمع شدہ رقم : اگر چہ تجارتی انشورنس جائز نہیں ہے اور اس میں جو زائد رقم ادا کی جاتی ہے، وہ ربا ہے؛ لیکن اصل رقم حلال ہے، اس میں زکوٰۃ ان صورتوں میں واجب ہوگی، جن میں حادثہ پیش نہ آنے کے باوجود رقم قابل واپسی ہوتی ہے، جن میں رقم قابل واپسی نہیں ہوتی، وہ دَین کے حکم میں نہیں ہے؛ اس لئے ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

○ عام طور پر گورنمنٹ ملازمین کی ماہانہ تنخواہ سے کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے اور مدت ملازمت کی انتہاء پر حکومت اضافہ کے ساتھ وہ رقم واپس کرتی ہے، اس میں اضافہ شدہ رقم ملازم کا حکومت یا کمپنی پر دَین ہے ہی نہیں؛ کیوں کہ یہ حکومت یا کمپنی کی طرف سے تبرع ہے اور جب حکومت یہ رقم دے دے، جب ہی وہ اس کا مالک ہوتا ہے؛ لیکن جو رقم قانون کے تحت کاٹ لی جاتی ہے، وہ اگر چہ دَین ہے؛ لیکن دائن کو اس پر ملکیت تامہ حاصل نہیں؛ کیوں کہ وہ اس میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتا؛ لہٰذا اگر چہ یہ دَین مؤجل ہے؛ لیکن اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے اور یہی علماء ہند کا فتویٰ ہے۔

○ شیئرز کی خرید وفروخت میں ایک طریقہ ''مارجن سیل'' کا ہے؛ اگر چہ عام طور پر بہت تھوڑی مدت کے لئے اس میں خریدار شیئرز اُدھار خرید کر پھر اسے بیچ دیتا ہے؛ لیکن فی الجملہ یہ بات ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنا شیئر دوسرے شخص سے زیادہ مدت کے لئے اُدھار فروخت کرے، بشرطیکہ شیئر ایسے مال کی نمائندگی کرتا ہو، جس کی اُدھار خرید وفروخت جائز ہے۔

یہ چند شکلیں ہیں، اس کے علاوہ اور بھی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں، جن میں ایک فریق کا عوض دوسرے کے ذمہ دَین ہو اور یہ دَین ایک مقررہ مدت کے بعد قابل ادائے گی ہو۔

اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ دیون کی زکوٰۃ کے سلسلے میں فقہاء کے ان اقوال کی بنیاد عام طور پر نصوص پر نہیں ہے؛ بلکہ شریعت کے مقاصد اور اس کے بنیادی اُصولوں کو سامنے رکھ کر اجتہاد سے کام لیا گیا ہے اور دونوں جہتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں، یہ بھی کہ فقراء کا فائدہ ہو اور ان کو ان کا حق ملے، اور یہ بھی کہ زکوٰۃ چوں کہ مواساۃ کے قبیل سے ہے اور زکوٰۃ مالِ نامی میں واجب ہوتی ہے؛ اس لئے ایسا نہ ہو کہ مالکانِ مال جس مال میں تصرف کرنے کے موقف میں بھی نہ ہوں، ان میں بھی زکوٰۃ واجب قرار دے دی جائے اور ان کے حق میں زیادتی ہو جائے۔

خلاصۂ بحث

ان جہتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیر کی رائے یہ ہے کہ :

(الف) کسی بھی وجہ سے جس دَین کی وصولی کی اُمید باقی نہیں رہی ہو، خواہ مدیون کے مفلس و دیوالیہ ہونے کی وجہ سے یا اس کے انکار کی وجہ سے، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(ب) تجارت اور استثمار کی بنیاد پر جو دیون مؤجلہ دوسرے کے ذمہ ہوں، ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی؛ البتہ دائن کو اختیار ہوگا کہ سال بہ سال زکوٰۃ ادا کرتا رہے یا وصول ہونے کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ ادا کرے، زکوٰۃ کا وجوب اس لئے ہوگا کہ یہ مالِ تجارت کا بدل ہے؛ لہٰذا جو حکم مالِ تجارت کا ہے، وہی حکم اس کا بھی ہونا چاہئے، اور دَین وصول ہونے کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ ادا کرنے کی سہولت اس لئے کہ اس میں دونوں کے حقوق کی رعایت ہے، زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو سہولت مل جاتی ہے اور فقراء کو ان کا حق مل جاتا ہے —— یہی جمہور فقہاء کی رائے ہے۔

(ج) قرضِ حسنہ کے طور پر جو دَین لیا جائے، اگر وہ ایک سال سے زیادہ مدت تک قابل ادائے گی ہو تو موجودہ دور میں قرض وصول ہونے کے بعد ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہونا چاہئے، پوری مدت کی نہیں، جیسا کہ مالکیہ، سعید ابن مسیّب اور عطاء ﷺ وغیرہ کا مذہب ہے؛ کیوں کہ قرضِ حسنہ خالصتاً تبرع ہے، جو زیادہ تر کرنسی کی شکل میں دیا جاتا ہے، افراطِ زر کی وجہ سے کرنسی کی قدر میں مسلسل کمی ہوتی جاتی ہے، اگر کسی شخص نے ایک لاکھ ڈالر کسی شخص کو پانچ سال کے لئے بطور قرض کے دیئے تو پانچ سال کے بعد اس کی قوت خرید ۷۵ ہزار ڈالر کی ہوجاتی ہے، پھر اگر ہم اس پر مزید ساڑھے ۱۲ ؍ ہزار ڈالر گذشتہ پانچ سال کی زکوٰۃ بھی واجب قرار دیں، تو قریب قریب چالیس فیصد اصل رقم سے وہ محروم ہوجائے گا؛ اس لئے موجودہ حالت میں یہ عدل اور اعتدال پر مبنی رائے نظر آتی ہے۔

(د) جو دَین مالِ تجارت کے عوض میں نہ ہو اور نہ قرضِ حسنہ ہو؛ بلکہ غیر تجارتی مال یا خدمت یا کسی اور حق کا عوض ہو، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، جب دَین وصول ہوجائے اور حولانِ حول بھی ہوجائے تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب وعلمه أتم وأحكم ۔

○ ○ ○

قبل تعمیر یا زیر تعمیر عمارت میں خریدے گئے
مکان ودکان کی بقایا رقم پر زکوٰۃ کا مسئلہ

مولانا جنید پالن پوری ●

آج کل بازار میں قبل تعمیر یا زیر تعمیر عمارت میں فلیٹ یا دکان بک کروانے یعنی خریدنے کا عام معمول ہے اور اس قسم کے معاملات میں پروجیکٹ کا پورا نقشہ شائع ہوتا ہے، جس میں فلیٹ اور دکان کے سارے کوائف مذکور ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے خریدی ہوئی چیز میں کسی قسم کی ایسی جہالت یا ابہام نہیں رہتا جو بعد میں نزاع یا اختلاف کا سبب بنے۔

اس طرح کے پروجیکٹ میں فلیٹ یا دکان بک کروانے پر بعض مرتبہ بلڈر کو سو فیصد یکمشت رقم دے دی جاتی ہے اور اکثر پچاس فیصد رقم ابتداءً دی جاتی ہے اور پھر ہر منزل بننے پر رقم جمع کرنے کا معاہدہ ہوتا ہے۔

ہماری اس مجلس میں زیر بحث یہی دوسری صورت ہے کہ ابتداءً پچاس فیصد دینے کے بعد ہر منزل بننے پر کچھ رقم کے دینے کا وعدہ ہوتا ہے۔

اب اس صورت میں صانع (بلڈر) کو جو رقم ابتداءً دے دی گئی ہے، اس پر تو زکوٰۃ نہیں آئے گی؛ البتہ جو رقم صانع (بلڈر) کو ادا کرنی باقی ہے، کیا مستصنع (خریدار) کے ذمہ باقی ماندہ رقم پر زکوٰۃ آئے گی یا نہیں؟

اس مسئلہ کا انحصار زیر بحث معاملہ اور عقد کے لازم اور غیر لازم ہونے پر ہے، اب اگر اس معاملہ کو عقد لازم مانا جائے گا تو باقی ماندہ رقم پر زکوٰۃ نہیں آئے گی اور اگر عقد غیر لازم یعنی استصناع مانیں گے تو زکوٰۃ لازم ہوگی یعنی قرض میں محسوب نہ ہوگی۔

دراصل بیع استصناع قیاسی اعتبار سے جائز نہیں ہونی چاہئے؛ چوں کہ اس میں شئ معدوم کی بیع ہو رہی ہے اور معدوم شئ کی بیع درست نہیں ہے، مگر تعامل ناس اور لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر اس کو استحساناً جائز قرار دیا ہے :

واما جوازه فالقياس ان لا يجوز لأنه بيع ماليس عند الإنسان لا على

● خادم: مدرسہ انوار محمدی، ممبئی۔

وجه السلم وقد نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع ماليس عند الإنسان ورخص فى السلم ويجوز استحساناً لإجماع الناس على ذلك لأنهم يعملون ذلك في سائر الأعصار من غير نكير ۔ (۱)

(يصح) استصناع (استحساناً) لا قياساً لأنه بيع المعدوم (فيما تعورف كخف وطست وقمقمة) لا فى غير كجباب ونسج ثياب كما يأتى (وهو) اجارة ابتداءً حتى لو مات الصانع قبل تسليمه لا يستوفى من تركته (بيع) انتهاءً قبل تسليمه حتى ثبت له خيار الروية ۔ (۲)

زیر بحث عقد اور معاملہ کو بیع استصناع ماننے کی صورت میں ابتداءً یہ معاملہ اجارہ کا ہوتا ہے اور مکمل رقم کی ادائے گی کے وقت یہ بیع ہوجاتی ہے یعنی جب آخری قسط ادا کی جارہی ہوتی ہے اس سے ایک ساعت قبل یہ معاملہ بیع کا ہوجاتا ہے۔

ولو كانت مواعدة لا معاقدة لكان لا يصير الأجر ملكاً له ، فدل أنها تنعقد معاقدة لا مواعدة ، ثم كيف ينعقد معاقدة (يقول) ينعقد اجارة ابتداءً ويصير بيعاً انتهاءً متى سلم قبل التسليم بساعة ۔ (۳)

اب ظاہر ہے عقدِ اجارہ میں جو رقم دینا باقی ہوتی ہے اس پر زکوۃ آتی ہے، لہٰذا زیرِ تعمیر یا قبل تعمیر عمارت میں خریدے ہوئے مکان یا دکان کے معاملہ کو بیع استصناع شمار کیا جائے گا تو اس میں رقم صانع (بلڈر) کو دینا باقی ہوگی اس پر زکوۃ آئے گی یعنی قرض میں محسوب نہ ہوگی؛ کیوں کہ یہ ابھی عقد اجارہ ہے؛ بیع تو مکمل رقم کی ادائے گی کے وقت ہوگی، اب بیع استصناع ماننے کی صورت میں چند باتیں خود بہ خود لازم ہوجائے گی۔

اولاً : فلیٹ یا دکان کی مکمل رقم کی ادائے گی سے قبل اگر صانع (بلڈر) کا انتقال ہوجاتا ہے تو یہ فلیٹ اور دکان مکمل تیار ہوچکی ہوگی یا تیار ہونا باقی ہوگی، ہر دو صورت میں فلیٹ اور دکان صانع (بلڈر) کے ترکہ میں شمار ہوکر اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگی اور مستصنع (خریدار) کو اس کی دی ہوئی رقم لوٹادی جائے گی، یعنی وہ رقم جو اس نے اب تک جمع کی ہے، چاہے ملکیت کا دام کتنا ہی کیوں نہ بڑھ گیا ہو :

بأن الصانع إذا مات قبل تسليم العمل بطل الإستصناع ولا يستوفى المصنوع من تركته ولو انعقد بيعاً ابتداءً وانتهاءً الا يبطل بموته ، كما فى بيع العين والسلم ۔ (۴)

---

(۱) بدائع الصنائع:۴/۹۳-۹۴۔ (۲) سکب الأنهر فی شرح ملتقى الابحر:۳/۱۴۹-۱۵۰۔

(۳) المحيط البرهانی:۱۰/۳۶۴،كتاب البيوع ، الفصل الرابع والعشرون فى الاستصناع۔

(۴) المحيط البرهانی:۱۰/۳۶۴،هكذا سكب الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر:۳/۱۴۹-۱۵۰،كتاب البيوع۔

بیع استصناع کا یہ حکم سامنے آنے کے بعد صانع (بلڈر) سے معاہدہ کے وقت مذکورہ معاملہ ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے؛ تاکہ مستقبل میں خلافِ شرع کام ہو نہ کسی طرح کا نزاع ہو اور اگر اس معاملہ کو اگریمنٹ پیپر اور معاہدہ کے کاغذات پر نہیں لایا گیا تو صانع (بلڈر) کی موت پر جو نزاع ہوگا وہ نا قابل تحمل ہوگا۔

ظاہری بات ہے ایسی صورت میں شاید ہی کوئی مستصنع (خریدار) معاملہ کرنے پر راضی ہو اور جب راضی نہیں ہوگا تو گویا جس ضرورت اور غرض کی بنیاد پر اس معاملہ کو خلاف قیاس استحساناً جائز قرار دیا گیا ہے وہ ضرورت اپنی جگہ باقی رہ جائے گی اور لوگوں کا حرج دور نہ ہوگا۔

ثانیاً : بیع استصناع ماننے کی صورت میں مستصنع (خریدار) کے لئے اس فلیٹ اور دکان کو فروخت کرنا درست نہ ہوگا، جب تک کہ مکمل رقم ادا نہ کردیں، چاہے فلیٹ اور دکان مکمل تیار ہوگئی ہو یا جوازِ بیع کی حد تک تیار ہوئی ہو؛ چوں کہ ابھی یہ اجارہ ہے اور بیع مکمل ہوگی آخری قسط ادا کرنے پر۔

اس صورت میں انویسٹرس (فلیٹ اور دکان کی تجارت کرنے والوں) کو حرج عظیم ہوگا؛ چوں کہ آج کل اکثر حضرات پچاس فیصد پر ہی فلیٹ اور دکان بک کرواتے ہیں، یعنی کل قیمت کا نصف حصہ ہی شروع میں دیتے ہیں اور پھر ہر منزل کے بننے پر قسط وار رقم دینے کا معاہدہ ہوتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ صانع (بلڈر) عمارت جلد از جلد بنانے کی فکر کرتا ہے، اب یہ انویسٹر جب تک مکمل رقم ادا نہ کردیں فلیٹ اور دکان بیچ نہیں سکتا؛ کیوں کہ ابھی یہ اجارہ ہے اور اس طرح کے جتنے معاملات اب تک ہوئے ہیں خلافِ شرع ہونے کی وجہ سے قابل فسخ ہیں۔

ثالثاً : بیع استصناع اور عقدِ غیر لازم ماننے کی صورت میں صانع (بلڈر) کے لئے مستصنع (خریدار) کی طرف سے بک کروائے گئے، فلیٹ اور دکان کو اس کی رویت اور رضامندی سے پہلے کسی اور کو بھی بیچنے کا حق ہوگا اور اگر بیچ دے گا تو مستصنع اس بیع اور معاملہ کو ختم کرنے کا مجاز بھی نہ ہوگا اور اس کو تو اب تک کی جمع کی ہوئی رقم لوٹا دی جائے گی :

> **واما بعد الفراغ من العمل قبل ان يراه المستصنع فكذلك حتى كان للصانع أن يبيعه ممن شاء — إلى ان قال — ولو استهلكه قبل الرؤية فهو كالبائع إذا استهلك المبيع قبل التسليم ۔ (۱)**
>
> **وأما كيفية جوازه فهي أنه عقد غير لازم في حق كل واحد منهما قبل رؤية المستصنع وأما كيفية جوازه فهي أنه عقد غير لازم في حق كل واحد منهما قبل رؤية المستصنع والرضابه حتى كان للصانع أن يمتنع من الصنع وأن يبيع المصنوع قبل أن يراه المستصنع ۔ (۲)**

---

(۱) بدائع الصنائع:۹۵/۴۔ (۲) بدائع الصنائع:۴۴۴/۴۔

اس صورت میں تو حرج نا قابل بیان ہے اور لازمی طور پر مفضی الی النزاع ہے جو نا قابل تحمل ہے اور شریعت مطہرہ نے ہر معاملہ میں نزاع سے بچایا ہے۔

البتہ اس تیسری صورت میں دھوکہ اور نزاع سے بچانے کے لئے یہ کیا جاسکتا ہے کہ بلڈر سے مکمل بیع کا وعدہ لیا جائے اور یہ کہ وہ کسی اور کو نہ بیچے۔

اب اس وعدۂ بیع کا وفا دیانتاً لازم ہے یا قضاءً تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے بعضوں نے اسے دیانتاً لازم قرار دیا ہے کہ بلڈر خریدے ہوئے فلیٹ اور دکان مستصنع کو ہی بیچنے پر اخلاقی طور پر بندھا ہوا ہے تاہم اگر مستصنع کی رویت اور رضا سے قبل کسی اور کو بیچ دیں تو گنہگار ضرور ہوگا؛ البتہ عدالت اور قضاء کے ذریعہ اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔

اور بعض فرماتے ہیں کہ بیع وشراء اور معاملات میں وفائے عہد قضاءً بھی لازم ہے کہ بلڈر مستصنع کے علاوہ کسی اور کو بیچ نہیں سکتا، اگر بیچ دے گا تو کورٹ اور عدالت کے ذریعہ اس کو فسخ کرایا جاسکتا ہے، راجح قول بھی یہی ہے۔

وافوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً (بنى اسرائيل) يايها الذين آمنوا لم تقولون مالا تفعلون كبر مقتا عند الله ان تقولوا مالا تفعلون ۔

امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کام کو کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے، خواہ وہ عبادات میں سے ہو یا معاملات میں سے اسے پورا کرنا اس پر لازم ہے(۱) وفائے عہد دیانتاً وقضاء کی بحث مطلق خریداری کے معاملہ میں اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۹۴/۵ تا ۱۰۱ عنوان ''خریداری کا وعدہ'' سے ملخصاً ماخوذ ہے۔

بیع استصناع میں وفائے عہد کو قضاءً لازم ماننے کی صورت میں تیسرا حرج تو دور ہو جائے گا تاہم پہلا اور دوسرا حرج بدستور اپنی جگہ باقی رہے گا، نیز پہلے حرج میں ضرورت کے اپنی جگہ باقی رہنے کے ساتھ مفضی الی النزاع کا بھی خطرہ ہے اور تعامل ناس کا بھی خطرہ ہے اور تعامل ناس کے بھی خلاف ہے۔

رابعاً : بیع استصناع کو عقد غیر لازم ماننے کی صورت میں اگر بلڈر کی طرف سے اپنے مفاد کی خاطر یا واقعتاً قانونی اڑچنوں کی وجہ سے تعمیری کام نہ ہوا تو یہاں کس بنیاد پر بلڈر سے آج کا بھاؤ اور قیمت لینے کی خاطر حیلہ کریں گے؛ کیوں کہ پہلا عقد ہی مکمل نہیں ہوا؛ بلکہ مکمل ہونے سے پہلے ہی منسوخ ہو گیا۔

اور اگر زیر بحث معاملہ کو عقد لازم مانا جاتا ہے تو تمام حرج خود بہ خود دور ہو جائیں گے۔

اولاً : بلڈر کے مرنے پر زیر تعمیر عمارت میت یعنی بلڈر کے ترکہ میں نہیں جائے گی :

---

(۱) احکام القرآن للجصاص: ۴۲۰/۳۔

بأن الصانع إذا مات قبل تسليم العمل بطل الإستصناع ولا يستوفى المصنوع من تركته ولو انعقد بيعاً وانتهاءً لا يبطل بموته كما فى بيع العين والسلم ۔ (۱)

ثانیاً : مکمل عمارت بننے پر یا جواز بیع کی حدتک بننے پر اس کا بیچنا بھی درست ہوگا۔

ثالثاً : بلڈر کے لئے مستصنع کی طرف سے رضاء اور رویت سے پہلے فلیٹ اور دکان کسی اور کو بھی بیچنے کا حق نہ ہوگا۔

رابعاً : تعمیری کام نہ ہونے پر حیلہ کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔

لہٰذا زیر بحث مسئلہ کو عقد لازم ماننے کی صورت میں جو رقم بلڈر کو دینا باقی ہے وہ قرض میں محسوب ہوگی اور اس پر زکوۃ نہیں آئے گی۔

ماہنامہ ''البلاغ'' دارالعلوم کراچی میں ایک استفتاء کے جواب میں مفتی عصمت اللہ صاحب دامت برکاتہ رقم طراز ہیں :

استصناع صحیح اور راجح قول کے مطابق بیع (Sale) ہی ہے یعنی وعدہ بیع نہیں ہے؛ لہٰذا اس میں جو رقم مقرر ہوئی ہے وہ ثمن کے حکم میں ہے، اب بکنگ کرانے والے نے جو رقم ایڈوانس یا قسطوں کی شکل میں جمع کرا ہی ہے اس کی زکوٰۃ بکنگ کرانے والے کے ذمہ واجب نہیں؛ کیوں کہ وہ رقم اس کی ملکیت سے نکل گئی اور جو قسطیں خریدنے والے کے ذمہ ابھی باقی ہیں وہ خریدنے والے کے ذمہ قرض ہے؛ لہٰذا وہ قابل زکوٰۃ اموال سے منہا ہوں گی ''**لأن الدين مانع عن الزكوٰة تجما هو فى الشامية** ''۔(البلاغ:۲/۲۶۰)

اس جواب کی تصدیق کرنے والوں میں شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہ اور مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہ شامل ہیں۔

البتہ عقد لازم ماننے کی صورت میں ایک سوال لازمی طور پر اُٹھائے گا کہ عقد لازم ماننے کی صورت معدوم کی بیع لازم ماننے کی صورت میں معدوم بیع لازم آئے گی اور حدیث شریف میں اس سے روکا گیا ہے :

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع ماليس عند الإنسان ورخص فى السلم ۔ (۲)

---

(۱) المحیط البرہانی:۱۰/۳۶۴۔ (۲) بدائع الصنائع:۴/۹۳۔

اس سوال اوراعتراض پر یہ جواب ہوسکتا ہے کہ خود شریعت مطہرہ نے ضرورت کی جگہوں پر اور تعامل ناس کی وجہ سے معدوم کی بیع کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ خود بیع سلم اور بیع استصناع بس اس بات کا مکمل لحاظ کیا ہے کہ مبیع میں کسی طرح کا ابہام اور جہالت نہ رہے۔

> **نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع ماليس عند الإنسان ورخص في السلم ، ويجوز استحساناً لإجماع الناس على ذلك لأنهم يعملون ذلك في سائر الأعصار من غير نكير ۔ (۱)**

اسی طرح متعین اُجرت کے عوض دخول حمام کا بھی مسئلہ ہے کہ غسل کرنے والا کتنا پانی استعمال کرے گا اور کتنا وقت اندر رہے گا، یہ سب مجہول ہونے کے باوجود تعامل ناس کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے :

> **والقياس يترك بالإجماع ولهٰذا ترك القياس في دخول الحمام بالأجر من غير بيان المدة ومقدار الماء الذي يستعمل ۔ (۲)**

زیر بحث مسئلہ میں فلیٹ اور دکان جو کہ مبیع ہے اس میں کسی قسم کا ابہام نیز کسی قسم کی کوئی جہالت باقی نہیں رہتی؛ حتیٰ کہ فلیٹ اور دکان کے حدود اربعہ کے ساتھ اندر لگنے والی تمام اشیاء کی کوالٹی اور کونسی کمپنی کی ہوں گی تمام مذکور ہوتا ہے؛ لہٰذا بعد میں چل کر کسی قسم کے نزاع کا اندیشہ نہیں رہتا، نیز اس طرح کے معاملہ کو عقد لازم ماننا تعامل ناس میں داخل ہے اور لوگوں کی ضرورت بھی عقد لازم ماننے کی صورت میں پوری ہوگی اور عقد لازم ماننے کی صورت میں زبردست نزاع کا خطرہ ہے، نیز تعامل ناس کے بھی خلاف ہے اور ضرورت بہ دستور اپنی جگہ باقی رہ جائے گی۔

○ ○ ○

---

(۱) بدائع الصنائع: ۴/ ۹۳-۹۴۔ (۲) بدائع الصنائع: ۴/ ۹۴۔

زندگی سے مایوس مریضوں کا علاج

خالد سیف اللہ رحمانی

شریعت اسلامی کا ایک امتیازی پہلو اس کا توازن واعتدال ہے، اسلام سے پہلے عیسائیت اور مختلف مذاہب میں رہبانیت یعنی ترک دنیا کو تقویٰ کی راہ سمجھا جاتا تھا؛ لیکن اسلام نے رہبانیت کو ناپسندیدہ طریقہ اور بعض قوموں کی گھڑی ہوئی بدعت قرار دیا ''وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا ''(۱) اسلام نے نفس انسانی کی تہذیب وتربیت کے لئے ضرور بعض ایسے احکام بھی دیئے ہیں، جو طبیعت کو گراں گزرتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے خود نماز کے بارے میں کہا ہے: ''إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ، الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُم مُّلاَ قُوْا رَبِّهِمْ ''(۲) لیکن اس میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ کوئی ایسا حکم نہ دیا جائے، جو انسان کے لئے نا قابل برداشت ہو جائے: ''لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا ''(۳) یہود نے احکام شریعت کے معاملے میں شدت کا رویہ اختیار کیا تھا اور بطور غلو کے بعض احکام اپنے لئے طے کر لئے تھے، اس کو ''اِصر'' (بوجھ) سے تعبیر فرمایا گیا اور مسلمانوں سے دُعاء کرائی گئی ''وَلاَ تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْراً كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلاَ تُحَمِّلْنَا مَا لاَ طَاقَةَ لَنَا بِهِ ''۔(۴)

زندگی کی حفاظت کی اہمیت اور اس کی تدبیریں

اسی اعتدال کا ایک پہلو یہ ہے کہ شریعت نے جیسے دین کے احکام کو بڑی اہمیت دی ہے، اسی طرح انسانی زندگی اور صحت کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے؛ چنانچہ قرآن مجید نے طالوت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے: ''إِنَّ اللهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِيْ الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ''(۵) اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''المومن القوى خير وأحب إلى من المؤمن الضعيف ''(۶) عہد نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ کو عبادت

---

(۱) الحدید: ۵۷۔
(۲) البقرۃ: ۴۵-۴۶۔
(۳) البقرۃ: ۲۸۶۔
(۴) البقرۃ: ۲۸۶۔
(۵) البقرۃ: ۲۴۷۔
(۶) مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان، حدیث نمبر: ۶۷۷۴۔

میں بڑا انہماک تھا، وہ چاہتے تھے کہ ہر دن روزہ رکھیں اور پوری رات عبادت میں گزار دیں، آپ ﷺ نے ان کو اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

فلا تفعل ، صم افطر وقم ونم فإن لجسدک علیک حقا وإن لعینک علیک حقا وإن لزوجک علیک حقا وإن لزورک علیک حقا وإن بحسبک أن تصوم من کل شهر ثلا ثة أيام ۔ (۱)

ایسا مت کرو، کبھی روزہ رکھو، کبھی روزہ ترک کرو، رات کو نماز بھی پڑھو، آرام بھی کرو؛ کیوں کہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمانوں کا بھی حق ہے، تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہر ماہ تین روزے رکھ لیا کرو۔

شریعت کے اسی مزاج و مذاق کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے شریعت کے جو مقاصد خمسہ متعین کئے ہیں، ان میں حفظ دین کے بعد دوسرا درجہ حفظ نفس کا رکھا گیا ہے، جان کی حفاظت کے لئے تین طرح کی تدبیروں کا شریعت نے حکم دیا ہے :

(۱) حادثات سے بچنے کی کوشش۔

(۲) کھانے پینے کا حکم۔

(۳) علاج کا حکم۔

حادثات سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش

حادثات سے بچنے کی کوششوں کے سلسلے میں آپ نے متعدد ہدایات دی ہیں، جیسے آپ نے سوتے وقت چراغ بجھانے کا حکم دیا کہ کہیں گھر میں آگ نہ لگ جائے، (۲) ہتھیار اس طرح لے کر چلنے کو منع فرمایا کہ وہ کھلے ہوئے ہوں اور اس کا رُخ باہر کی طرف ہو کہ مبادا کسی کو چبھ جائے، (۳) اس بات سے بھی منع فرمایا کہ ہتھیار لہرایا جائے، (۴) چھوٹے بچوں کو شام کے وقت گھر میں رکھنے کو کہا گیا اور اس سے منع کیا گیا کہ بچے شام کے وقت گلیوں میں پھرا کریں؛ کیوں کہ اس میں کیڑے مکوڑے اور جنات وشیاطین کا خوف ہوتا ہے، قرآن مجید نے ایک اُصولی

---

(۱) بخاری ، کتاب الصوم ، باب حق الجسم فی الصوم، حدیث نمبر:۱۹۷۵۔ (۲) بخاری ، بدء الخلق ، إذا وقع الذباب فی شراب أحدکم، حدیث نمبر:۳۳۱۶، نیز دیکھئے: سنن ترمذی ، کتاب الادب۔

(۳) مسلم، کتاب البر، باب امر من مر بسلاح، حدیث نمبر:۲۶۱۴۔ (۴) حوالۂ سابق۔

بات کہی ہے ''وَلاَ تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ''(۱)اس میں ہرطرح کے حادثات سے احتیاط کاحکم شامل ہے، انسان پر قاتلانہ حملہ اوراکراہ بھی ایک ایسا حادثہ ہےجس سے انسانی جان کوخطرہ درپیش ہوتا ہے،قرآن مجید میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ اگرکوئی شخص اکراہ کی صورت حال سے دوچار ہو،تواس کے لئے جان بچانے کی غرض سے کلمہ کفر کاتلفظ کرنے کی گنجائش ہے''إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيْمَانِ''(۲)غور کیا جائے تو یہ بھی حادثاتی موت سے بچنے ہی کی ایک تدبیر ہے،فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگرکوئی شخص کشتی میں سفر کررہا ہو،کشتی میں آگ لگ جائے،اسے تیرنا آتا ہو،تواس پرواجب ہے کہ وہ سمندر میں کودکر اپنے آپ کوبچانے کی کوشش کرے ـــــ غرض کہ اس بات پرفقہاء کا اتفاق ہے کہ آدمی پر اپنے آپ کوحادثات سے بچانا اور دوسروں کوبھی اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا واجب ہے، یہی وجہ ہے کہ قتل عمد کی طرح قتل خطاء میں بھی دیت واجب ہوتی ہے؛ کیوں کہ قتل خطاء میں اگرچہ قاتل کی نیت بری نہیں ہوتی؛مگر وہ بےاحتیاطی کی روش اختیار کرتا ہے۔

غذا سے انتفاع

اس پربھی تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ حفظ نفس کی دوسری تدبیر غذا سے استفادہ کرنا ہے،قرآن مجید نے حکم دیا:''كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلاَ تُسْرِفُوْا''(۳)اکل وشرب کاحکم دینے میں بھی حفاظت نفس ملحوظ ہےاوراسراف سے منع کرنے میں بھی؛ کیوں کہ کھانے میں اسراف سے مال کا ضیاع بھی ہےاورصحت کی بربادی بھی،غذا کے استعمال کوشریعت میں اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ اگرکوئی شخص حالت اضطرار میں ہوتواس کوخنزیر اورمردار بھی کھانے کی اجازت دی گئی ہے،جوحرام لعینہٖ ہے:''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَلا إِثْمَ عَلَيْهِ''(۴)حالت اضطرار میں محرمات کوکھا کرجان بچانے کاحکم وجوبی ہے، یہاں تک کہ اگرکسی شخص نے اس رخصت سے فائدہ نہیں اُٹھایا اوراس کی موت واقع ہوگئی تووہ گنہگار رہوگا؛چنانچہ علامہ داماد آفندیؒ فرماتے ہیں :

> من امتنع عن أكل الميتة حال المخمصة أم صام ولم يأكل حتى مات أثم ، لأنه أتلف نفسه لما بينا أنه لا بقاء إلا بالأكل ، والميتة حال المخمصة إما حلال أم مرفوع الإثم فلا يجوز الامتناع عنه إذا تعين لإحياء النفس ۔ (۵)

(۱) البقرۃ:۱۹۵۔ (۲) النحل:۱۰۶۔

(۳) الاعراف:۳۱۔ (۴) البقرۃ:۱۷۳۔

(۵) مجمع الأنهر:۲/۵۲۴۔

جوشخص اضطرار کی حالت میں مردار کے کھانے سے رکا رہے یا روزہ رکھے اور کچھ نہ کھائے ، یہاں تک کے اس کی موت واقع ہوجائے تو گنہگار ہوگا ؛ اس لئے کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا ہے ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ کھائے بغیر انسانی زندگی کی حفاظت نہیں ہوسکتی ؛ حالاں کہ اضطرار کی حالت میں مردار یا تو حلال ہوتا ہے یا اس کا گناہ ختم ہوجاتا ہے ؛ لہٰذا جب زندگی بچانے کے لئے اسی کا کھانا متعین ہے تو اب اس سے اپنے آپ کو روکے رکھنا جائز نہیں ہوگا۔

نیز علامہ ابن عابدین شامیؒ کا بیان ہے :

فإن ترک الأکل والشرب حتی هلک فقد عصی ، لأن فيه إلقاء النفس إلی التهلكة فإنه منهی عنه فی حکم التنزیل ۔ (۱)

لہٰذا اگر اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ؛ اس لئے کہ اس نے اپنے نفس ہلاکت میں ڈالا ؛ اس لئے قرآن کے حکم کے مطابق یہ ممنوع ہوگا۔

مسروق اور ابوالحسن طبری المعروف بالکیاہراسی کے بارے میں مفسرین نے نقل کیا ہے :

عن مسروق قال : من اضطر فلم یأکل ولم یشرب ثم مات دخل النار ۔ (۲)

جوشخص مضطر ہوجائے پھر بھی نہ کھائے اور پیئے یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہوجائے تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔

قال ابوالحسن الطبری المعروف بالکیا :

ولیس أکل المیتة عند الضرورة رخصة بل هو عزیمة واجبة ، ولو امتنع من أکل المیتة کان عاصیا ۔ (۳)

ضرورت کے وقت مردار کا کھنا صرف جائز ہی نہیں ہے ؛ بلکہ عزیمت کے درجہ میں ہے اور واجب ہے ، اگر مردار کے کھانے سے رُک جائے تو گنہگار ہوگا۔

---

(۱) ردالمحتار:۹/۴۸۹۔

(۲) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر:۱/۲۰۶۔

(۳) الجامع لأحکام القرآن للقرطبی:۲/۲۳۲۔

علاج اوراس کی اہمیت

حفظ نفس کی تیسری تدبیر علاج ہے، علاج کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے؛ چنانچہ چندروایتیں یہاں ذکر کی جاتی ہے :

○ عن أبی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عيه وسلم ما أنزل الله داء إلا أنزل الله شفاء ۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری اُتاری ہے اس سے شفاء کا ذریعہ بھی اُتارا ہے۔

○ عن أسامة بن شريک قال : أتيت النبی صلی الله عليه وسلم وأصحابه كأنما علی رؤسهم الطير فسلمت ثم قعدت ، فجاء الأعراب من هاهنا وهاهنا فقالوا : يا رسول الله ! أنتداوی ؟ فقال : تداووا فإن الله تعالٰی لم يصنع داء إلا وضع له دواء غير داء واحد الهرم ۔ (۲)

حضرت اسامہ بن شریک ﷺ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے صحابہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے، میں نے سلام کیا پھر میں بیٹھ گیا، یہاں سے وہاں سے دیہات کے لوگ آرہے تھے، ان لوگوں نے دریافت کیا: کیا ہم علاج ومعالجہ کرسکتے ہیں؟ آپ نے ارشادفرمایا: علاج کراؤ، اللہ تعالیٰ نے بوڑھاپے کے سوا کوئی ایسی بیماری نہیں رکھی جس کا علاج نہیں رکھا۔

○ عن أبی الدرداء قال : قال رسول الله صلی الله عليه وسلم : إن الله أنزل الداء والدواء وجعل لكل داء دواء فتداووا ولا تداووا بحرام ۔ (۳)

---

(۱) بخاری ، کتاب الطب ، باب ما انزل الله داء إلا أنزل الله شفاء ، حدیث نمبر:۵۶۷۸، ترمذی ، أبواب الطب ، باب ماجاء فی الدواء والحث عليه ، حدیث نمبر:۲۰۳۸۔

(۲) ابوادؤ ، کتاب الطب ، باب الرجل يتداوی ، حدیث نمبر:۳۸۵۵۔

(۳) ابوداؤد ، کتاب الطب ، باب فی الأدوية المكروهة:۳۸۷۴۔

حضرت ابودرداء ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بیماری بھی دی ہے اور اس کا علاج بھی؛ لہٰذا علاج کرایا کرو اور حرام شئے سے علاج نہ کرو۔

○ عن صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ قال : قالوا یا رسول اللہ أنتداوی ؟ قال : تعلمن أن اللہ لم ینزل داء إلا أنزل له دواء غیر داء واحد قالوا : وماهو قال : الهرم (۱)

حضرت صفوان بن عسال ؓ سے مروی ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا ہم علاج کرا سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم جان لو کہ اللہ نے ہر بیماری کا علاج پیدا کیا ہے، سوائے ایک بیماری کے اور وہ بوڑھاپا ہے۔

بعض صحابہ کو شبہ تھا کہ شاید علاج اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر یقین کے منافی ہے، آپ ﷺ نے اس کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

○ عن حکیم بن حزام قال : قلت : یا رسول اللہ ! أرأیت أدویة نتداوی بها ورقیٔ نستربها أترد من قدراللہ ؟ قال : إنها من قدر اللہ ۔(۲)

حضرت حکیم ابن حزام ؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ہم جو دواؤں سے علاج کرتے ہیں یا جھاڑ پھونک کرتے ہیں آپ کی کیا رائے ہے، کیا وہ اللہ کی تقدیر کو رد کر سکتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا: یہ بھی اللہ کی تقدیر ہی کا حصہ ہے۔

متعدد واقعات میں یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ کے بعض رفقاء بیمار پڑے آپ نے ان کے لئے طبیب بلائے اور ان کا علاج کرایا:

○ عن أبی هریرة رضی اللہ عنه قال : أحتف برجل من الأنصار یوم أحد فدعا له رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم طبیبین کانا بالمدینة فقال : عالجاه ، فقالا : یا رسول اللہ ! إنا کنا نعالج ونحتال فی الجاهلیة فلما جاء الإسلام ، فما هو إلا التوکل ، فقال : عالجاه فإن الذی أنزل الداء أنزل الدواء ثم جعل فیه شفاء قال : فعالجاه فبرأ ۔ (۳)

---

(۱) **أخرجه الحاکم فی المستدرک و قال : هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه ، کتاب الطب حدیث نمبر: ۷۴۲۷۔**

(۲) المستدرک علی الصحیحین ، کتاب الطب حدیث نمبر: ۷۴۳۱۔

(۳) أبو نعیم الاصفهانی فی "الطب النبوی" باب فی احضار الاطباء: ۱/۱۸۸۔

حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن ایک انصاری صحابی کو لوگ گھیرے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دو معالج طلب فرمائے جو مدینے میں تھے، آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ ان کا علاج کریں، ان دونوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! ہم دونوں زمانۂ جاہلیت میں علاج کیا کرتے تھے اور صحت کے بعض ذرائع اختیار کرتے تھے، جب اسلام آ گیا، تو اب ہم لوگ توکل کے قائل ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا: ان کا علاج کرو، جس خدا نے بیماری اُتاری ہے، اسی نے دوا بھی اُتاری ہے اور اس میں شفاء رکھی ہے؛ چنانچہ دونوں نے مریض کا علاج کیا اور مریض کو صحت ہوگئی۔

○ عن زيد بن أسلم أن رجلا في زمان رسول الله صلى الله عليه وسلم جرح فاحتقن الدم فدعى له رجلين من بني أنمار فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أيكما أطب ، فقال أحدهما : أوَ في الطب خير يارسول الله ؟ فقال : إن الذي أنزل الداء هو الذي أنزل الدواء ۔ (۱)

حضرت زید بن اسلم ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک صاحب زخمی ہو گئے ان کا خون بہنے لگا، آپ نے ان کے لئے قبیلۂ بنوانمار کے دو افراد کو بلایا، پھر آپ نے فرمایا: تم میں سے کس کو علاج کے معاملے میں زیادہ مہارت ہے، ان دونوں میں سے ایک نے کہا: اللہ کے رسول! کیا علاج کرنے میں بھلائی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: جس خدا نے بیماری اُتاری ہے، اسی نے علاج بھی اُتارا ہے۔

○ عاد رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا به جرح فقال : ادعولي طبيب بني فلان فدعوه فجاء ، فقالوا : يا رسول الله ! ويغني الدواء شيئا ؟ فقال سبحان الله ، وهل أنزل الله من داءٍ في الأرض إلا جعل له شفاء ، عن رجل من الأنصار ۔ (۲)

حضرت زید ابن اسلم ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک زخمی شخص کی عیادت فرمائی، آپ نے فرمایا کہ میرے پاس بنی فلاں کے طبیب کو بلادو؛ چنانچہ وہ

(۱) مؤطا امام مالک، کتاب العین، باب تعالج المریض، حدیث نمبر: ۱۹۸۹۔

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۱۵۶۔

آ گئے ،ان لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا علاج بھی کسی چیز سے بچا سکتا ہے، آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا اللہ نے زمین میں کوئی ایسی بیماری بھی رکھی ہے جس سے شفاء کا سامان نہ رکھا ہو۔

○ عن جابر رضی الله عنه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم دخل علی سعد بن أبی وقاص وهو یشتکی قال سعید : فوضع رسول الله صلی الله علیه وسلم یده علی صدری حتی وجدت بردها علی فؤادی فقال لی : أنت رجل مفئودٌ أرسل إلی الحارث بن کلدة فإنه رجل مستطبب فلتأخذ سبع ثمرات من عجوة وشیئا من قسط هندی وشیئا من ورس وشیئا من زیت فلتدق التمرات بنواهن ثم تجمع ذلک والتدؤ ففعل فیرئ ۔(۱)

رسول اللہ ﷺ حضرت سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے وہ بیمار تھے؛ چنانچہ حضرت سعد راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا، یہاں تک کہ میں نے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس کی ،آپ نے مجھ سے فرمایا: تم ایک بیمار شخص ہو، حارث ابن کلدہ کے پاس آدمی بھیجو، وہ علاج سے واقف شخص ہے، نیز تم سات عجوہ کھجور کچھ قسطِ ہندی، کچھ ورس اور کچھ تیل لو اور کھجوروں کو گٹھلی سمیت باریک کردو، پھر اشے اکٹھا کردو اور اسے دوا کے طور پر استعمال کرو؛ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور انھیں صحت ہوگئی۔

فقہاء کے اقوال

اس تاکید کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء نے بعض اہم شرعی احکام مستنبط کئے ہیں؛ چنانچہ علاج کے لئے حرام اور ناپاک اشیاء کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاوی ہندیہ میں ہے :

ویجوز للعلیل شرب الدم والبول وأکل المیتة للتداوی إذا أخبره طبیب مسلم أن شفاءه فیه ولم یجد من المباح ما یقوم مقامهُ ۔ (۲)

مریض کے لئے خون اور پیشاب پینے اور مردار کے کھانے کی علاج کی غرض سے

---

(۱) أخرجه أبوداؤد، کتاب الطب، باب فی تمرة العجوة: ۳۸۷۵ والطبرانی۔ (۲) الهندیه: ۳۵۵/۵۔

اجازت ہے، بشرطیکہ کسی مسلمان طبیب نے بتایا ہو کہ اس میں اس کے لئے شفاء ہے اوراس کا کوئی جائز متبادل موجود نہ ہو۔

زہریلی چیز کا کھانا حرام ہے؛ لیکن علامہ ابن قدامہ مقدسی حنبلی صراحت کرتے ہیں کہ بطور علاج کے مسموم چیزوں کا استعمال بھی جائز ہوگا :

وما فيه السموم من الأدوية إن كان الغالب من شربه واستعماله الهلاک أو الجنون لم يبح شربه وإن كان الغالب منه السلامة ويرجى منه المنفعة فالأولٰى إباحة شربه لدفع أخطر منه كغيره من الأدوية ويحتمل أن لا يباح لأنه يعرض نفسه للهلاک فلم يبح كما لم يرد به التداوی ، والأول الأصح ؛ لأن كثيرا من الأدوية يخاف منه وقد أبيح لدفع ما هو أضر منه فإذا قلنا يحرم شربه فهو كالمحرمات من الخمر ونحوه وإن قلنا : يباح فهو كسائر الأدوية المباحة ۔ (۱)

جن دواؤں میں زہر ہو، اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس کے پینے اوراس کے استعمال کرنے سے ہلاکت ہوجائے گی ، یا پاگل ہوجائے گا، تو اس کا پینا جائز نہیں اوراگر غالب گمان ہے کہ وہ ان چیزوں سے محفوظ رہے گا، نیز اس سے نفع کی اُمید ہو تو اولیٰ یہ ہے کہ اس سے زیادہ بڑے خطرے سے بچنے کے لئے اس کا استعمال کرنا مباح ہے، جیسا کہ دوسری دواؤں کا حکم ہے اوراس بات کا بھی احتمال ہے کہ مباح نہ ہو؛ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے لئے پیش کررہا ہے؛ اس لئے مباح نہیں ہوگا، جیسا کہ اس صورت کا حکم ہے؛ جب کہ علاج کا ارادہ نہ ہو اور پہلی رائے زیادہ درست ہے؛ اس لئے کہ بہت سی دواؤں سے اس طرح کا خوف ہوتا ہے اوراس سے علاج کی اجازت دی گئی ہے؛ تا کہ اس سے زیادہ نقصاندہ چیز سے بچاؤ ہو؛ لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ اس کا پینا حرام ہے تو وہ شراب اور دوسرے محرمات کی طرح ہے اوراگر ہم کہتے ہیں کہ وہ مباح ہے تو وہ دوسری مباح دواؤں کی طرح ہے۔

فقہا مالکیہ نے صراحت کی ہے کہ علاج کے لئے سانپ تک کھانے کی اجازت ہے :

الباجی : لا بأس بأكل الحية على وجه التداوی إذا امن أذا ها وخشاش الأرض ۔ (۲)

---

(۱) المغنی لإبن قدامه:۵۲/۲۔ (۲) التاج والاكليل على مختصر خليل:۲۳۸/۴۔

باجی کہتے ہیں کہ علاج کے طور پر سانپ اور زمین کے کیڑے مکوڑے کھانا جائز ہے، جب کہ اس کے نقصان کا خطرہ نہ ہو۔

حقنہ دینے میں کشف عورت کا غالب امکان ہے؛ لیکن فقہاء نے علاج کے طور پر اس کی بھی اجازت دی ہے :

ولا بأس بالحقنة يريد به التداوى ؛ لأن التداوى مباح بالإجماع وقد ورد بإباحته الحديث ۔ (۱)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

وقد قيل أن للضرورة وجها ثانيا أن يمرض الرجل المرض يقول له أهل العلم به أو يكون هو من أهل العلم به قلما يبرأ من كان به مثل هذا إلا أن يأكل كذا أو يشرب كذا أو يقال له إعجل ما يبرأک أكل كذا أو شرب كذا ، فيكون له أكل ذلک وشربه ما لم يكن خمرا ۔ (۲)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ضرورت کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ ایک شخص کسی بیماری کا علاج کرے، جو لوگ علاج کے فن سے واقف ہیں وہ اس سے کہیں کہ جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو، وہ بہت کم فلاں یا فلاں چیز کھائے بغیر صحت یاب ہوتا ہے یا اس سے کہا جائے کہ تم کو فلاں چیز کھانے یا پینے سے جلد صحت ہوگی، تو اس کے لئے اس چیز کا کھانا پینا جائز ہوگا بشرطیکہ وہ شراب نہ ہو۔

علاج کا حکم شرعی اور فقہاء کی آراء

فقہاء کی ان تصریحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شریعت میں علاج کو کتنی زیادہ اہمیت حاصل ہے، اگر فقہاء کے اقوال کا جائزہ لیا جائے تو جمہور کے نزدیک شراب کو چھوڑ کر حرام ونجس اشیاء سے بھی علاج درست ہے اور شراب کے بارے میں اگر چہ اختلاف ہے؛ لیکن متعدد اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی متبادل نہ ہو تو اس سے بھی علاج ہے اور ایسی صورت میں یہ حرام کے دائرہ سے باہر نکل آتا ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ شریعت میں علاج کا حکم کیا ہے؟ اس سلسلے میں مجموعی طور پر پانچ رائیں نقل کی گئی ہیں :

پہلی رائے

اول یہ کہ علاج جائز نہیں ہے، یہ رائے بعض صوفیہ کی طرف منسوب کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

---

(۱) هداية مع البناية:۱۲/۲٦۷۔ (۲) كتاب الأم:۲/۲۵۳۔

خودعلاج کرایا ہے،اورآپ ﷺ نے علاج کرانے کی ترغیب بھی دی ہے،ان احادیث کی موجودگی میں صوفیاء کی یہ بات کیسے قابل قبول ہوسکتی ہے؟ خودحدیث میں صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے علاج کوبھی قدر کاایک حصہ قرار دیاہے۔

علامہ قرطبیؒ ''فیہ شفاء للناس '' سے علاج کے جواز پراستدلال کرتے ہوئے اوران صوفیاء پرردکرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> **وھو یرد علی الصوفیة الذین یزعمون أن الولایة لا تتم إلا إذا رضی بجمیع ما نزل به من البلاء ، ولا یجوز له مداواة ، ولا معنی لمن أنکر ذلک ۔ (۱)**
>
> یہ حکم ان صوفیاء کی تردید کرتا ہےجن کا گمان ہے کہ ولایت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک تمام آزمائشوں پرانسان راضی نہ ہوجائے ، نیز اس کے لئے علاج جائزنہیں،حقیقت یہ ہے کہ جولوگ علاج کا انکارکرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

الفاظ کےتھوڑے فرق کے ساتھ یہی بات علامہ بدرالدین عینی نےلکھی ہے،(۲) خودسرخیل صوفیاءامام غزالیؒ نے بھی اس پرردفرمایا ہےلکھا ہے کہ علاج خلاف توکل نہیں ہے؛ بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے،(۳) فقہ مالکی کی معروف کتاب''الفواکه الدوانی علی رسالة ابی زید القیروانی''میں ہے :

> **وجواز التداوی لا ینا فی التوکل والاعتماد علی اللہ علی القول المعتمد من قول الصوفیة وغیرھم فقد کان صلی اللہ علیه وسلم یتعاطی لاسباب التداوی مع أنه اعظم المتوکلین علی اللہ سبحانه وتعالیٰ ۔ (۴)**
>
> علاج کا جائز ہونا توکل اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے منافی نہیں ہے ،صوفیا اوردوسرےلوگوں کامعتمدقول ہے؛چنانچہ رسول اللہ ﷺ علاج کےاسباب اختیارفرمایا کرتے تھے باوجودیکہ آپ تمام متوکلین میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

---

(۱) الجامع لأحکام القرآن:۱۰/۱۳۸۔

(۲) دیکھئے:عمدۃ القاری:۱۴/۲۶۹،باب ما انزل اللّٰه له داء إلا أنزل له شفاء۔

(۳) دیکھئے:احیاء علوم الدین ، کتاب التوحید والتوکل۔

(۴) الفواکه الدوانی علی رسالة ابی زید القیروانی:۸/۱۴۲۔

اس سلسلے میں علامہ ابن القیمؒ نے چشم کشا گفتگو کی ہے :

وفی الأحادیث الصحیحه الأمر بالتداوی وأنه لا ینافی التوکل کما لاینا فیه دفع داء الجوع والعطش والحر والبرد بأضدادها ؛ بل لا تتم حقیقة التوحید إلا بمباشرة الأسباب التی نصبها الله مقتضیات لمسبباتها قد را وشرعا، وأن تعطیلها یقدح فی نفس التوکل ...... ویقال لمورد هذا السؤال : هذا یوجب علیک أن لا تباشر سببا من الأسباب التی تجلب بها منفعة أو تدفع بها مضرة ؛ لأن المنفعة والمضرة ؛ إن قدرتا لم یکن بد من وقوعهما وإن لم تقدرا لم یکن سبیل إلی وقوعهما ۔ (۱)

صحیح ومعتبر احادیث میں یہ حکم موجود ہے کہ علاج کرایا جائے اور اس بات کی رہنمائی ہے کہ علاج توکل کے منافی نہیں ہے؛ جیسے بھوک اور پیاس، گرمی اور سردی میں اس کی ضد کے ذریعہ میں مدافعت کرنے میں کوئی حرج نہیں ؛ بلکہ توحید کی حقیقت ان اسباب کو اختیار کئے بغیر پوری نہیں ہوسکتی ،جن کو اللہ تعالیٰ نے شرعاً اور خلقاً ان کے سبب کا تقاضا بنا کر پیدا کیا ہے اور ان کو معطل کردینا خود توکل کو متاثر کرتا ہے اور اس طرح کا سوال کرنے والے سے کہا جائے گا کہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم کوئی ایسی چیز ہی اختیار نہ کرو جو جلب منفعت یا دفع مضرت کا ذریعہ ہو، اس لئے کہ اگر منفعت ومضرت مقدر ہی ہے تو واقع ہوکر رہے گی اور اگر مقدر نہیں ہے تو ان کا واقع ہونا ممکن نہیں۔

دوسری رائے

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علاج کرانا مباح ہے اور نہ کرانا مستحب ہے، حضرت ابوبکر صدیق ،حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوالدرداءؓ کا عمل بھی یہی منقول ہے، نیز حسن بصریؒ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے:''**کان یکره شرب الأدویة کلها إلا اللبن والعسل**''۔(۲)

حنابلہ کا مشہور ومفتیٰ بہ قول یہی ہے :

○ **ویباح التدوای بمباح وترکه أفضل ۔ (۳)**

---

(۱) زاد المعاد:۴/۱۵-۱۶۔ (۲) الجامع لأحکام القرآن للقرطبی:۱۰/۱۳۹۔

(۳) الروض المربع شرح زاد المستقنع:۱/۳۲۱۔

مباح شئے سے علاج کرنا جائز ہے اور نہ کرنا افضل ۔

○ مسألة التداوی مباح وترکه أفضل نص علیه واختاره القاضی وجماعة ۔ (۱)

علاج کرانا مباح ہے نہ کرانا افضل ہے، امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے اور قاضی ابویعلی اور ایک گروہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ان حضرات کے پیش نظر بعض روایات ہیں :

○ سبعون ألفاً یدخلون الجنة لا حساب علیهم الذین لا یکتوؤن ولا یسترقون ولا یتطیرون وعلی ربهم یتوکلون ۔ (۲)

ستر ہزار لوگ اس طرح جنت میں داخل ہوں گے کہ ان سے حساب وکتاب نہیں لیا جائے گا، یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ داغ کر علاج کرائیں گے، نہ جھاڑ پھونک کرائیں گے، نہ بدشگونی لیں گے اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کریں گے۔

○ عن ابن عباس عن الجاریة التی کانت تصرع ، وقالت النبی صلی الله علیه وسلم أن یدعو لها ، قال : إن أحببت أن تصبری ولک الجنة ، وإن أحببت دعوت الله أن یشفیک ، فقالت : بل أصبر ؛ ولکنی أنکشف فادع الله لی أن لا أنکشف فدعا لها أن لا تنکشف ۔ (۳)

حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ سے اس باندی کے بارے میں مروی جو بے ہوش ہوجایا کرتی تھی اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے دُعاء کی درخواست کی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم چاہو تو صبر کرو اس کے بدلے تمہیں جنت حاصل ہوگی اور چاہو تو میں اللہ سے دُعاء کروں تمہیں شفا عطا فرمادیں گے، انھوں نے عرض کیا؛ بلکہ میں صبر سے کام لوں گی ؛ لیکن میں بے ستر ہوجاتی ہوں ، میرے لئے اللہ سے دُعاء فرمائیں کہ اس کی نوبت نہ آئے، آپ نے اس کے لئے دُعاء فرمائی کہ وہ بے ستر نہ ہوجایا کرے۔

---

(۱) المبدع فی شرح المقنع:۲/۲۱۳۔ (۲) کتاب الرقاق، باب یدخل الجنة سبعون الفاً بغیر حساب، حدیث نمبر:۶۱۷۵۔

(۳) رواہ البخاری ، کتاب المریض ، باب فضل مایصرع من الریح، حدیث نمبر:۵۳۲۸۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین کے سامنے بنیادی طور پر یہ بات ہے کہ رضاء بہ تقدیر کا تقاضا یہی ہے کہ بندہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہے؛ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ جس عمل کو خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ہو، وہ خلافِ مستحب عمل کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر آپ ﷺ نے محض بیان جواز کے لئے علاج کرایا ہوتا تو وہ احادیث قولیہ موجود نہ ہوتیں، جن میں آپ ﷺ نے لوگوں کو علاج کرانے کی ترغیب دی ہے اور آپ ﷺ کا یہ عمل بھی نہ ہوتا کہ آپ ﷺ نے مختلف صحابہ کے علاج کے لئے اطباء بلائے ہیں اور اہتمام کے ساتھ ان کا علاج کرایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ستر ہزار لوگوں کے جنت میں بلاحساب کے داخل کئے جانے کے سلسلہ میں ''لا یتطببون'' کے جو الفاظ آتے ہیں، سیاق وسباق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا منشاء یہ ہے کہ اللہ کے بجائے لوگوں کا علاج پر یقین نہ ہونا چاہئے، وہ طب وعلاج یا جھاڑ پھونک کو مؤثر حقیقی نہ سمجھیں، حضرت ابوبکر صدیق ؓ یا بعض اور صحابہ کے علاج سے گریز کرنے کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں امراض کی تشخیص اور علاج کے فن نے اتنی ترقی حاصل نہیں کی تھی کہ اس سے صحت کا غالب گمان پیدا ہو؛ اس لئے ممکن ہے کہ انھوں نے علاج کو بے فائدہ سمجھا ہو۔

جن خاتون کو آپ ﷺ نے صبر کی تلقین کی اس میں علاج کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ دُعاء کا ذکر ہے اور ممکن ہے کہ منجانب اللہ آپ ﷺ کے علم میں یہ بات ہو کہ ان کے لئے شفاء مقدر نہیں ہے۔

تیسری رائے

تیسری رائے یہ ہے کہ علاج کرانا مستحب ہے، جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہی ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ کی حدیث ''لکل داء دواء فإذا أصیب دواء الداء برئ بإذن اللہ عزوجل'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> **فی ھذا الحدیث إشارة إلی استحباب الدواء وھو مذھب أصحابنا وجمھور السلف وعامة الخلف ...... وفیه رد علی من أنکر التداوی من غلاة الصوفیة وقال : کل شئ بقضاء وقدر فلا حاجة إلی التداوی ، وحجة العلماء ھذہ الأحادیث ویعتقدون أن اللہ تعالٰی ھو الفاعل وأن التداوی أیضا من قدر اللہ وھذا کالأمر بالدعاء ۔ (۱)**
>
> اس حدیث میں علاج کے مستحب ہونے کی طرف اشارہ ہے، یہی ہمارے اسلاف کا اور جمہور سلف وخلف کی رائے ہے......اس میں ان غالی صوفیا کی تردید بھی ہے جو

---

(۱) شرح نووی علی مسلم ، باب لکل داء دواء واستحباب التداوی ،نیز دیکھئے:فتح الباری:۱۵۹/۱۰،مرقاۃ المفاتیح ، کتاب الطب والرقی:۲۴۰/۸۔

علاج کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شئے قضاء وقدر سے متعلق ہے؛ لہٰذا علاج کی ضرورت نہیں (ان کے مقابلہ) یہ حدیثیں اہل علم کی دلیل ہیں، ان علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے اور علاج بھی اللہ کی تقدیر کا ایک حصہ ہے اور یہ ایسے ہی جیسے کہ دُعاء کا حکم دیا گیا ہے۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب فتاویٰ تاتارخانیہ میں نوازل ابواللیث سمرقندی کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

الرجل إذا ظهر به داء فقال الطبيب : قد غلب الدم فأخرجه فلم يخرجه حتى مات لا يكون ما جورا ۔ (۱)

کسی آدمی کو جو بیماری ظاہر ہوئی طبیب نے کہا کہ خون بڑھ گیا ہے؛ لہٰذا خون نکال لو، مگر مریض نے نہیں نکالا، یہاں تک کہ اس کی موت ہوگئی تو اس کو (علاج سے گریز کے اس عمل پر کوئی ثواب نہیں ہوگا۔

نیز فتاویٰ ہندیہ میں بھی صراحت ہے کہ اگر علاج کے نتیجہ خیز ہونے کی اُمید ہو تو علاج کرانا چاہئے :

فى الجراحات المخوفة ، والقروح العظيمة الحصاة الواقعة فى المثانة ونحوها إن قيل : قد ينجو وقد يموت أو ينجو ولا يموت يعالج ، وإن قيل : لا ينجو أصلا لا يداوى بل يترك كذا فى الظهيرية ۔ (۲)

خوف ناک اور بڑے زخموں یا مثانے وغیرہ میں ہوجانے والے پتھری کے بارے میں اگر کہا گیا کہ علاج کے ذریعہ یہ صحت یاب بھی ہوسکتا ہے اور اس کی موت بھی ہوسکتی ہے، یہ کہ علاج سے صحت یاب ہوجائے گا اور مرنے سے بچ جائے گا، تو اس کا علاج کرانا چاہئے اور اگر کہا جائے کہ اس کے صحت یاب ہونے کی بالکل اُمید نہیں ہے تو علاج نہیں کرایا جائے اور یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

شوافع نے بھی علاج کو عام طور پر مسنون یا مستحب لکھا ہے :

ويسن التداوى للمريض أو يستحب له ۔ (۳)

مریض کے لئے علاج کرانا مسنون یا مستحب ہے۔

---

(۱) الفتاویٰ التاتار خانیه:۱۸/۱۹۹۔ (۲) الهندیه:۵/۳۵۴۔

(۳) الاقناع فی حل الفاظ أبی الشجاع:۱/۲۰۹۔

حنابلہ کی بعض کتابوں میں بھی علاج کوسنت اور بعض میں مستحب قرار دیا گیا ہے :

ویسن التداوی بخبر : إن اللہ لم یضع داء إلا جعل له دواء غیر الهرم ۔ (۱)

اس حدیث کی بنا پر کہ بوڑھاپے کے سوا کوئی بیماری نہیں جس کا علاج نہ ہو، علاج کرانا مسنون ہے۔

اس بات کوایک دوسرے حنبلی فقیہ نے ان الفاظ میں کہا ہے :

ویتوجه أنها مسئلة التداوی وأنه یستحب للخبر ۔ (۲)

فقہاء حنابلہ میں ابن قیم اور بعض دوسرے اہل علم بھی علاج کے مستحب ہونے کے قائل ہیں :

واختار القاضی وابن عقیل وابن الجوزی وغیرہ فعله (أی التداوی) ۔ (۳)

قاضی ابن عقیل بن جوزی وغیرہ نے علاج کرانے کے قول کوترجیح دی ہے۔

اس نقطۂ نظر کی دلیل وہ حدیثیں ہیں جو علاج کی ترغیب کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ، نیز یہ بات کہ آپ ﷺ نے خود اپنا علاج کرایا اور آپ کا قول اور عمل اگر وجوب کی دلیل نہ ہوتو کم سے کم استحباب پرتو ضرور ہی دلالت کرتا ہے۔

چوتھی رائے

چوتھا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علاج مطلقاً مباح ہے ، یہ مستحب ہے اور نہ خلاف مستحب ؛ چنانچہ امام مالک سے منقول ہے:"**لا بأس بذالک**"(۵)— بظاہر ان حضرات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جن احادیث میں علاج کرانے کا امر ہے، وہ امر ارشاد ہے، امر وجوب نہیں ہے؛ اسی لئے مختلف فقہا سے یہ بات منقول ہے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو، مگر علاج نہ کرائے ، یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہوجائے تو وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا :

وفی النوازل : استطلق بطنه أو رمدت عیناہ فلم یعالج حتی أضعفه ومات فیه لا إثم علیه ۔ (۵)

نوازل ابواللیث سمرقندی میں ہے کہ کسی کودست ہو یا اس کو آشوب چشم ہوگیا پھر بھی علاج نہیں کرایا، یہاں تک کہ کمزور ہوگیا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو اس کو گناہ نہیں ہوگا۔

---

(۱) الاقناع:۱/۱۹۳۔ (۲) الفروع وتصحیح الفروع:۲/۱۳۲۔

(۳) حاشیة الروض المربع لإبن القیم:۵/۶۔ (۴) الجامع لاحکام القرآن:۱۰/۱۳۹۔

(۵) الفتاویٰ التاتار خانیه:۱۸/۱۹۹،هندیه:۵/۳۵۴۔

اس طرح کی بات مختلف مذاہب فقہیہ کی کتابوں میں موجود ہے؛لیکن یہ دراصل ایسے علاج سے متعلق ہے جس کا نافع ہونا موہوم یا کم سے کم مشکوک ہو؛اسی لئے متعدد اہل علم نے یہ بات لکھی ہے کہ جان بچانے کے لئے کھانا تو واجب ہوگا؛لیکن علاج واجب نہ ہوگا؛ کیوں کہ کھانے کا نافع ہونا یقینی ہے اور علاج کا نافع ہونا یقینی نہیں؛ چنانچہ علامہ ابن بزار کردری فرماتے ہیں :

امتنع عن الأكل حتى مات جوعاً أثم وإن عن التداوى حتى تلف مرضا لا ؛ لأن عدم الهلاك بالأكل مقطوع والشفاء بالمعالجة مظنون ۔ (۱)

کوئی شخص کھانے سے رُک گیا؛ یہاں تک کہ بھوک سے اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ گنہگار ہوگا اور اگر علاج سے رُک گیا، یہاں تک کہ بیماری کی وجہ سے وہ ہلاک ہوگیا یا اس کا کوئی عضو ضائع ہوگیا تو گنہگار نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ہلاک ہوجانا یقینی ہے اور علاج کی وجہ سے شفا حاصل ہونا غالب گمان کے درجہ میں ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ ہندیہ میں الفصول العمادیہ کے حوالہ سے اسباب کے مختلف درجات کا بڑا اچھا تجزیہ کیا گیا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

إعلم بأن الأسباب المزيلة للضرر تنقسم إلى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العطش والخبز المزيل لضرر الجوع ، وإلى مظنون كالفصد والحجامة وشرب المسهل ، وسائر أبواب الطب أعنى معالجة البرودة بالحرارة ومعالجة الحرارة بالبرودة ، وهى الأسباب الظاهرة فى الطب ، وإلى موهوم كالكى والرقية ، أما المقطوع به فليس تركه من التوكل ؛ بل تركه حرام عند خوف الموت ، وأما الموهوم ، فشرط التوكل تركه إذبه وصف رسول الله صلى الله عليه وسلم وآله المتوكلين ، وأما الدرجة المتوسطة وهى المظنونة كالمداواة بالأسباب الظاهرة عند الأطباء ففعله ليس مناقضا للتوكل بخلاف الموهوم وتركه ليس محظورا بخلاف المقطوع به ؛ بل قد

---

(۱) الفتاویٰ البزازیہ علی الھندیہ:۳۶۷/۶۔

یکون أفضل من فعله فی بعض الأحوال وفی حق بعض الأشخاص ، فهو علی درجة بین الدرجتین ۔ (۱)

جان لو کہ نقصان کو دور کرنے والے اسباب تین قسم کے ہیں: ایک وہ جو یقینی سبب ہے، جیسے: پانی جو پیاس کو دور کرتا ہے اور روٹی جو بھوک کو دور کرتی ہے اور دوسرے وہ جو ظن غالب کے درجہ میں ہے ، جیسے فصد لگوانا ، پچھنے لگوانا ، دست آور دواء کا پینا اور علاج کی تمام صورتیں ، یعنی ٹھنڈک کا گرمی سے اور گرمی کا ٹھنڈک سے علاج یہ طب کے ظاہر مسائل ہیں ، تیسرے وہ سبب جو موہوم کے درجہ میں ہے جیسے داغنا اور جھاڑ پھونک کرنا تو جو علاج یقینی ہو اس کو چھوڑ دینا توکل نہیں ؛ بالکلیہ اگر موت کا اندیشہ ہو تو اس سے اجتناب کرنا حرام ہے اور جو موہوم کے درجہ میں ہے متوکل ہونے کے لئے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے ؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے توکل کرنے والوں کی یہی صفت بیان کی ہے ، تیسرا درجہ ان دونوں کے درمیان ہے جو ظن غالب کے درجہ میں ہے ، جیسے اطباء کے رائے کے مطابق علاج کے لئے ظاہری وسائل کا اختیار کرنا تو اس کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے بخلاف موہوم سبب کے اور اس کو چھوڑ دینا ناجائز نہیں ہے ، بخلاف یقینی سبب کے بلکہ بعض صورتوں میں اور بعض اشخاص کے حق میں اس کو اختیار کرنا افضل ہوتا ہے ؛ لہٰذا یہ دو درجوں کے درمیان ایک درجہ ہے ۔

فقہاء مالکیہ کے یہاں بھی یہ وضاحت ملتی ہے :

والفرق بینها وبین التداوی أن التداوي لا یتیقن البرء منه ویتقین البرء من الغصة ۔ (۲)

(مضطر شخص کے لئے کسی چیز کے گھونٹنے) کے اور علاج کے درمیان فرق یہ ہے کہ علاج کے ذریعہ صحت مند ہونا یقینی نہیں اور پہلی صورت میں بچ جانا یقینی ہے ۔

فقہ شافعی کی معروف کتاب ''اسنی المطالب'' میں ہے :

فإن ترک التداوی توکلا ففضیلة ویفارق استحبابه وجوب أکل المیتة للمضطر وإساغة اللقمة بالخمر بأنا لا نقطع بإفادته بخلاف ذینک ۔ (۳)

---

(۱) الفتاویٰ الهندیه:۵/۳۵۵۔ (۲) شرح مختصر الخلیل للخرشی:۸/۴۹۳۔

(۳) أسنی المطالب فی شرح روض الطالب:۱/۲۹۵۔

اگر از راہ توکل علاج نہ کرائے تو یہ افضل ہے اور اس کے مستحب ہونے کا یہ حکم اس بات سے مختلف ہے کہ مردار کھانا اور شراب کے ذریعہ لقمہ اُترنا جائز ہے؛ کیوں کہ ہمیں علاج کے مفید ہونے کا یقین نہیں جب کہ ان دونوں کا نتیجہ خیز ہونا یقینی ہے۔

لہٰذا فقہاء کی اکثر عبارتیں جو صرف اباحت پر دلالت کرتی ہیں اور استحباب کی بھی نفی کرتی ہیں، ان کا تعلق ایسے علاج سے ہے، جس کے مفید ہونے کا ظن غالب نہ ہو۔

پانچویں رائے

پانچواں نقطۂ نظر یہ ہے کہ علاج کرانا واجب ہے، اگرچہ یہ رائے ائمہ متبوعین میں سے کسی کی نہیں ہے، یہاں تک کہ علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے ہے کہ گو متاخرین کے یہاں یہ قول موجود ہے؛ لیکن سلف میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں تھا :

إن شيخ الاسلام ابن تيمية قال : لست أعلم سالفا أوجب التداوى هو الخلاف عند المتأخرين موجود لكن من السلف يقولون : إنه محل إجماع أن التداوى ليس واجبا ؛ فلا يجب على الإنسان أن يتداوى وإن كان بعض أهل العلم قد استحبه لكنه لا يجب ، فلا يجب على الإنسان أن يتداوى ، لو أنه اختار أن يصبر فله ذلك ۔ (۱)

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: میں اس بات سے واقف نہیں ہوں کہ سلف میں سے کسی نے علاج کو واجب قرار دیا ہو؛ البتہ اس سلسلے میں متاخرین کے درمیان اختلاف موجود ہے، سلف میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ علاج واجب نہیں؛ لہٰذا انسان پر علاج کرانا واجب نہیں ہے؛ اگرچہ بعض اہل علم نے علاج کو مستحب قرار دیا ہے؛ لیکن وہ وجوب کے قائل نہیں، پس انسان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ علاج کرائے ہی اگر وہ صبر اور برداشت اختیار کرنا چاہئے تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے۔

لیکن فقہاء مالکیہ کے یہاں خصوصاً اور بعض اور فقہاء کے یہاں بھی علاج کے سلسلہ میں وجوب کا قول ملتا ہے :

ويجوز التداوى وقد يجب وسواء كان التداوى (ظاهراً) فى ظاهر

---

(۱) شرح العمدة لإبن قدامة:۱/۲۶۔

الجسد كوضع دوائعلى جرح (او باطنا) كسفوف وشربة لوجع الباطن الخ ـ (۱)

علاج جائز ہےاور کبھی واجب کہ درجہ میں بھی آجاتا ہے، چاہےعلاج جسم کے ظاہر حصے پر ہو، جیسے زخم پر دوا لگانا یا جسم کے باطنی حصہ میں ہے، جیسے: درد کے لئے صفوف اور شربت۔

فقہاءحنابلہ کے یہاں بھی اس طرح کا قول ملتا ہے :

وقال بعض العلماء : إنه يجب التداوى إذا ظن نفعه ـ (۲)

بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر علاج سے نفع کی اُمید ہوتو علاج کرانا واجب ہے۔

خود علامہ ابن تیمیہؒ رقمطراز ہیں :

وإنما اوجبه طائفة قليلة كما ذكره بعض صحاب الشافعى واحمد ـ (۳)

کچھ لوگوں نے علاج کو واجب بھی قرار دیا ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے بعض اصحاب نے ذکر کیا ہے۔

عام طور پر جو فقہاء کے یہاں وجوب کا قول نہیں ملتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں علاج کے فن نے موجودہ دور کی طرح ترقی نہیں کی تھی؛ اس لئے علاج کا نافع ہونا شک اور وہم کے درجہ میں ہوتا تھا، ورنہ شریعت میں انسانی جان کی جو اہمیت ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ قول اوفق بالشریعہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں علاج کرانا واجب ہے۔

درحقیقت علاج کو مباح قرار دینے والوں، مستحب کہنے والوں اور واجب سمجھنے والوں کی بنیادی دلیل وہی حدیثیں ہیں، جن میں علاج کا حکم دیا گیا ہے، (۴) جن لوگوں نے علاج کو مباح قرار دیا ہے، ان کے نزدیک امر ارشاد و اباحت کے لئے ہے، جن حضرات نے مستحب قرار دیا ہے، ان کے نزدیک استحباب کے لئے ہے اور جن حضرات نے واجب قرار دیا ہے، ان کے نزدیک امر اصل معنیٰ 'وجوب' پر محمول ہے۔

ان تمام نقاطِ نظر اور دلائل کو سامنے رکھ کر جو بات راجح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ علاج عام حالات میں مستحب، بعض حالات میں مباح اور بعض صورتوں میں واجب ہے؛ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) حاشية الصاوى على الشرح الصغير:۱/۲۳۰۔

(۲) التهذيب المقنع فى اختصار الشرح الممتع:۱/۴۷۷۔

(۳) فتاویٰ ابن تيميه:۲۱/۵۶۴۔

(۴) ابوداؤد ، كتاب الطب ، باب فى الرجل يتداوى، حدیث نمبر:۳۸۵۵۔

فإن الناس قدتنازعوا فی التداوی هل هو مباح أو مستحب أو واجب ؟ والتحقيق أن منه ما هو محرم ، ومنه ما هو مكروه ، ومنه ما هو مباح ، وقد يكون ماهو واجب ، وهو ما يحكم أنه يحمل به بقاء النفس لا بغيره كما يجب أكل الميتة عند الضرورة ، فإنه واجب عند الأئمة الأربعة وجمهور العلماء ، وقد قال مسروق : من اضطر إلی أكل الميتة ، فلم يأكل حتى مات دخل النار ، فقد يحصل أحيانا للإنسان إذا استحرَّ المرض مالم يتعالج معه مات ، والعلاج المعتاد تحصل معه الحياة كالتغذية للضعيف وكإستخراج الدم أحيانا ۔ (۱)

علاج کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ مباح ہے یا مستحب یا واجب، تحقیق یہ ہے کہ علاج کی بعض صورتیں حرام ہیں ،بعض مکروہ ہیں ،بعض مباح ہیں اور بعض واجب، واجب صورت وہ ہے کہ جب بتایا جائے کہ زندگی کا بقاء اس کے بغیر نہیں ہوسکتا ، جیسا کہ ضرورت کے وقت مردار کا کھانا جائز ہے کہ یہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک واجب ہے، نیز مسروق نے کہا کہ جو شخص مردار کے کھانے پر مجبور ہوگیا اور اس نے نہیں کھایا، یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا ،کبھی کبھی انسان پر ایسی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ بیماری شدت اختیار کرلیتی ہے اور اس کے باوجود علاج نہیں کیا گیا تو موت واقع ہوجاتی ہے، عادۃ جو علاج کیا جاتا ہے وہ زندگی کے تحفظ کا ذریعہ بنتا ہے، جیسے کمزور آدمی کا غذا لینا اور کبھی کبھی خون کا نکلوانا۔

فقہاء کی آراء کا ماحصل

- عام حالات میں علاج کا مستحب ہونا تو ظاہر ہے جیسا کہ امام نووی نے نقل کیا ہے کہ یہی جمہور کا مذہب ہے۔
- اگر انسان کا علاج اس لئے ضروری ہو کہ اس کے علاج نہ کرانے سے دوسروں کا حق متاثر ہوتا ہے، یا دوسروں کو ضرور پہنچتا ہو، جیسے کوئی شخص ایڈز کا مریض ہو کہ اس کے علاج نہ کرانے کی وجہ سے دوسرے متعلقین اس

---
(۱) مجموعه فتاویٰ شیخ الإسلام ابن تیمیه:۱۲/ ۱۸۔

مرض کے شکار ہوسکتے ہوں یا وہ عنین ہو اور اس کے علاج نہ کرانے کی وجہ سے بیوی کا حق متاثر ہوتا ہو تو ان صورتوں میں علاج کرانا واجب ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لا ضرر ولا ضرار** ''(۱) اور فقہاء کے یہاں مسلمہ قاعدہ ہے: ''**الضرر یزال** '' فقہاء نے اگر چہ یہ بات لکھی ہے کہ کسی شخص کو علاج پر مجبور نہیں کیا جاسکتا: ''**ویکرہ اکراہ المریض علیہ** ''(۲) اور یہ کہ فائدہ کی اُمید ہو تب بھی علاج واجب نہیں: ''**ولا یجب التداوی إذا ظن نفعہ** ''(۳) مگر یہ حکم اس وقت ہے جب کہ اس کے علاج کرانے اور نہ کرانے سے دوسروں کا نفع وضرر متعلق نہ ہو۔

○ اگر معالج کی رائے کے مطابق صحت یابی کی اُمید نہ ہو تو علاج کرنا بھی جائز ہے اور ترک علاج کی بھی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ مریض یا اس کے ولی کی یہ نیت نہ ہو کہ اس طرح جلد سے جلد متبلی بہ کی موت ہوجائے؛ کیوں کہ جو چیزیں مباح ہوتی ہیں، وہ بھی نیت ومقصد کے تابع ہوتی ہیں :

وأما المباحات فإنها تختلف صفتها باعتبار ما قصدت لأجله ۔ (۴)

مقصد کے اعتبار سے مباحات کی صفت بدلتی رہتی ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ جب کسی عمل کو کسی خاص مقصد کے لئے ترک کیا جائے تو وہ بھی ایک فعل کے درجہ میں ہوتا ہے جسے فقہ کی اصطلاح میں ''کف'' کہتے ہیں :

إن الکف فعل النفس فإن الفعل کما ینسب إلی الجوارح ینسب إلی النفس حینئذ فالترک من حیث لا یتصور أن یکون مثابا علیہ ۔ (۵)

لہٰذا اگر ترک علاج اس لئے ہو کہ مریض کی موت جلد واقع ہوجائے تو یہ ایک طرح پر اہلاک نفس کے درجہ میں ہے، ایسی صورت میں 'ترک علاج' گناہ اور حرام ہے اور اگر یہ نیت نہ ہو صرف اس قدر مقصود ہو کہ اب علاج کا فائدہ نہیں ہے؛ لہٰذا کارِ عبث کیوں کیا جائے تو ترکِ علاج میں حرج نہیں۔

○ اگر علاج ممکن ہو؛ لیکن وہ مالی اعتبار سے مطلوبہ علاج کرانے کے موقف میں نہیں ہے تو اس صورت میں بھی ترک علاج جائز ہے؛ کیوں کہ: ''**لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها**''۔

صحت وزندگی سے مایوس عام مریضوں سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ علاج کے لئے مریض یا اس کے

---

(۱) رواہ ابن ماجہ ، کتاب الأحکام ، حدیث نمبر: ۲۳۴۱۔ (۲) الاقناع فی حل الفاظ ابی الشجاع: ۱/۲۰۹۔

(۳) الفروع وتصحیح الفروع: ۲/۱۳۲۔ (۴) الأشباہ والنظائر: ۱/۴۸۔

(۵) حموی علی الأشباہ: ۱/۹۵، القاعدۃ الاولی : لا ثواب إلا بالنیۃ ، ط : دارالکتب العلمیۃ۔

ولی کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟ — اس سلسلے میں یہ بات ظاہر ہے کہ علاج نفقہ کا حصہ ہے، اگر چہ فقہاء متقدمین علاج کو نفقہ کا حصہ خیال نہیں کرتے تھے؛ لیکن یہ اس بنیاد پر تھا کہ اس زمانہ میں علاج کے لئے زیادہ اخراجات کی ضرورت نہیں پڑتی تھی؛ لیکن نفقہ کی جو تعریف کی گئی ہے، اس میں یقینی طور پر علاج بھی داخل ہے :

وفی الشرع : الإدرار علی شئ بما فیه بقاؤہ ، کذا فی الفتح ۔ (۱)

شرعاً نفقہ ان چیزوں کا فراہم کرنا ہے جس میں انسانی زندگی کا بقاء ہو۔

کیوں کہ غذا سے بڑھ کر بقائے حیات کے لئے صحت وعلاج ضروری ہے، خود فقہاء متقدمین کے یہاں بھی بعض ایسی عبارتیں مل جاتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی علاج کو نفقہ کا حصہ تصور کرتے تھے؛ چنانچہ صاحب ہدایہ 'مضارب' کے نفقہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

أما الدواء ففی ماله (المضارب) فی ظاهر الروایة عن أبی حنیفه أنه یدخل فی النفقه ؛ لأنه لإصلاح بدنه ولا یتمکن من التجارة إلا به فصار کالنفقة ۔ (۲)

جہاں تک اس کے مال میں سے مضارب کے علاج کی بات ہے تو امام ابوحنیفہؒ سے منقول ظاہر روایت کے مطابق نفقہ میں شامل ہے؛ اس لئے کہ اس کا مقصد جسم کی اصلاح ہے اور اس کے بغیر تجارت ممکن نہیں ہے؛ لہذا یہ بھی نفقہ کی طرح ہے۔

موجودہ دور کے فقہاء کا عام رجحان یہی ہے کہ علاج بھی نفقہ میں شامل ہے، عالم اسلام کے فقہاء میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی (۳) اور علماء ہند میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (۴) نے اس کی صراحت کی ہے۔

اُصول یہ ہے کہ زوجیت کی بنا پر بیوی کا نفقہ جو شوہر پر واجب ہوتا ہے، وہ اس کے باوجود واجب ہوتا ہے کہ بیوی غنی ہو؛ کیوں کہ یہ نفقہ عورت کے ''احتباس للزوج '' کا عوض ہے محض تبرع نہیں ہے؛ لہذا بیوی کے علاج کی ذمہ داری بشرط استطاعت شوہر پر ہے، جس شخص کے پاس خود اتنا مال موجود ہو کہ وہ اپنا علاج کرا سکے، اس پر خود اپنا علاج کرنا واجب ہوگا اور ورثہ کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ وہ اس کا علاج کرانے میں حارج ہو جائیں اور جو خود اپنا علاج کرانے پر قادر نہ ہو، تو اقارب پر نفقہ واجب ہونے کی جو ترتیب اور جو تفصیل فقہاء نے لکھی ہے، اس کے مطابق ان اقارب پر اس مریض کا علاج کرانا واجب ہوگا۔

---

(۱) ردالمحتار:۵/۲۷۷۔ (۲) الهدایه ، باب المضارب یضارب:۳/۲۷۳۔

(۳) الفقه الاسلامی و أدلته:۷/۷۵۴۔ (۴) مباحث فقهیه:۳۰۶۔

خلاصۂ بحث

لہٰذا ان تفصیلات کی روشنی میں اس حقیر کی رائے یہ ہے :

(۱) جس مریض کے سلسلے میں معتبر معالجین کی رائے ہو کہ اب اس کی صحت کی واپسی کی اُمید نہیں ہے اور نہ اس کی زندگی کے بچنے کی اُمید ہے، تو ایسے مریض کے لئے اپنا علاج نہ کرانے کی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ اس کا مقصد جلد مرنا نہ ہو، یہی حکم مریض کے اولیاء کے لئے بھی ہے؛ کیوں کہ جمہور کے نزدیک علاج کرانا واجب نہیں ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس علاج کے نافع ہونے کی اُمید بھی نہ ہو۔

(۲) جو علاج مطلوب ہے، اگر علاج نافع ہوسکتا ہو؛ لیکن معاشی اعتبار سے اس پر قدرت نہ ہو تب بھی ''**لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا**'' کے تحت مریض پر علاج کرانا واجب نہیں ہے۔

(۳) اگر مریض خود اپنا علاج جاری رکھنا چاہے تو ورثہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے علاج کو روک دیں۔

(۴) اگر مریض آلہ تنفس پر ہو اور ڈاکٹروں نے مریض کی زندگی اور فطری طور پر نظام تنفس کی بحالی سے مایوسی ظاہر کردی ہو تو ورثہ کے لئے جائز ہوگا کہ مصنوعی آلۂ تنفس علاحدہ کردیں۔

(۵) اگر مریض مصنوعی آلہ تنفس پر ہو؛ لیکن ڈاکٹرس اس کی زندگی سے مایوس نہ ہوئے ہوں اور اُمید ہو کہ فطری طور پر تنفس کا نظام بحال ہوجائے گا تو مریض کے ورثہ کے لئے اسی وقت مشین کا ہٹانا درست ہوگا؛ جب کہ مریض کی املاک سے اس علاج کا جاری رکھنا ممکن نہ ہو، نہ ورثہ ان اخراجات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور نہ اس علاج کو جاری رکھنے کے لئے کوئی اور ذریعہ میسر ہو۔

○ ○ ○

حرم مکی میں داخل ہونے کے لئے کیا احرام ضروری ہے؟

محمد ظفر اللہ خاں ●

مقالہ نگار اگر چہ عالم دین نہیں ہیں، مگر اچھا علمی ذوق اور اہل علم سے تعلق رکھتے ہیں، وہ چوں کہ حرم شریف کے جوار میں مقیم ہیں اور وہاں کے حالات سے باخبر ہیں، اس لئے انھوں نے ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کے مجموعہ مجلّہ کے مطالعہ کی روشنی میں علماء کو دعوتِ فکر دینے کی غرض سے یہ تحریر لکھی ہے، اس کی حیثیت فتویٰ کی نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک دعوت غور وفکر ہے اور اسی لحاظ سے اس کو شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

اسلامک فقہ کیڈمی انڈیا کا دستواں فقہی سیمینار حج وعمرہ کے اہم موضوع پر تھا، اس سیمینار کی مکمل روداد مجلّہ ''حج وعمرہ'' کے عنوان سے شائع ہوگئی ہے، اکیڈمی نے بہت ہی عمدگی سے تیرہ سوالات پر مشتمل سوال نامہ ترتیب دیا تھا، جس میں پہلا سوال یہ ہے کہ ''اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ حج یا عمرہ کی نیت سے حرم مکی میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ احرام باندھ کر میقات کے اندر داخل ہو؛ لیکن جو لوگ حج یا عمرہ کی نیت نہیں رکھتے؛ بلکہ تجارت، ملاقات یا کسی اور مقصد سے مکہ مکرمہ یا حرم مکی کی حدود میں داخل ہونا چاہتے ہیں کیا ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ احرام باندھ کر ہی میقات سے آگے بڑھیں؟ اس سلسلے میں فقہاء مجتہدین کے مسالک اور دلائل کی تفصیل اور ترجیح کیا ہے۔

عرض مسئلہ بابت حج وعمرہ (سوال نمبر: ۱، ۲، ۸، مجلّہ حج وعمرہ) کے تحت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں کہ ''ان مسائل سے متعلق اکیڈمی کو کل ۴۵ جوابات موصول ہوئے ہیں، افسوس کہ بعض مقالہ نگاروں کی رائے واضح نہیں ہے'' ہمارا بھی یہی احساس ہے ـــ یہ مسئلہ چوں کہ موجودہ حالات میں بہت اہم ہے، اس لئے ہم اکیڈمی سے اور اکیڈمی کی توسط سے ان مقالہ نگار حضرات سے گذارش کرتے ہیں کہ (جن کی رائے ہر صورت حرم مکی میں داخل ہونے کے لئے احرام کی ہے) وہ مزید تحقیق اور غور وفکر فرمائیں، مناسب ہوگا کہ اکیڈمی ایک کمیٹی تجویز کردے، جس کے سارے ممبران دو سے تین مرتبہ حرم مکی مختلف موسم میں جاچکے ہوں اور ان کے سامنے آج کی دنیا کے سارے مسلمانوں کے وسائل ومسائل ہوں۔

● مقیم جدہ، سعودی عرب۔

ذیل میں ہم طالب علمانہ جسارت کے ساتھ کچھ نکات پیش کرر ہے ہیں ،جن سے مزید غور وفکر کے لئے انشاء اللہ سہولت ہوگی ، ہمارا شدید احساس ہے کہ موجودہ حالات میں حج وعمرہ کی جو روح ہے،اسے بار بار اُبھاریں اور یہ شاندار عبادت کبھی بھی بے روح نہ ہونے پائے ،مجلّہ حج وعمرہ کے ابتدائیہ میں محترم قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے بہت مختصر لیکن بہت مؤثر انداز میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

سوال نمبر:ا کے سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ احرام صرف اس پر لازم ہے جو حج یا عمرہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ میں داخل ہو، ورنہ ایک مسلمان بغیر احرام مکہ مکرمہ میں کبھی بھی داخل ہوسکتا ہے۔

(۱) حرم مکی کی شان یہ ہے کہ مشرک اس کے قریب نہ آئیں :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـذَا ۔ (التوبۃ:۲۸)

اے ایمان والو! مشرک جو ہیں سو پلید ہیں سونزدیک نہ آنے پاویں، مسجد الحرام کے اس برس کے بعد۔(معارف القرآن)

یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ جس طرح اس کا کلام پاک محفوظ ہے،اسی طرح اس کے محترم گھر کی حفاظت بھی اس نے اس طرح فرمائی کہ مشرکین کے دل میں اس کی ہیبت ہے اور مسلمانوں کے دل میں احترام ومحبت ہے،اس گھر کی شان وحرمت یہ ہے کہ ہر آنے والا ایمان بھرا دل لے آئے اور واپسی میں ایسا درس توحید لے جائے کہ اب تمام عمر شرک سے بیزار رہے۔

(۲) اس حرم پاک سے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا :

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُوْا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ (البقرۃ:۱۲۵)

اور جب مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کو اس کے واسطے اور جگہ امن کی اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو کہ پاک رکھو، میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے۔(معارف القرآن)

صاحب معارف القرآن لکھتے ہیں:''مَثَابَةً'' یہ لفظ ثَابَ،يَثُوْبُ،ثَوْباً ومَثَاباً ' سے ماخوذ ہے،جس کے معنی لوٹنے کے ہیں،اس لئے مثابہ کے معنی مرجع کے ہوگئے جہاں آدمی بار بار لوٹ کر جائے ،حرم مکی کی یہ صفت

''مثابۃ'' ذہن میں رہے، بار بار کی حاضری کی بحث کے موقع کے لئے اوپر کی آیت کے آخری حصہ کی تشریح میں صاحب معارف القرآن لکھتے ہیں کہ ''اول یہ ہے کہ بناء بیت اللہ کا مقصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، دوسرے یہ کہ طواف نماز سے مقدم ہے (کما روی عن ابن عباس) تیسرے یہ کہ اطراف عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے فرض ہو یا نفل۔ (بصاص)

کیا ایک مسلمان صرف طواف کے لئے اعتکاف کے لئے یا نماز کے لئے بیت اللہ شریف نہیں جا سکتا؟

(۳) دنیا میں تین مساجد کے لئے رختِ سفر باندھا جا سکتا ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ، حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں کی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے، اور مسجد حرام کی ایک نماز میری اس مسجد کی سو نمازوں سے افضل ہے، (۱) عام مساجد کے مقابلہ میں مسجد حرام میں نماز کا ثواب ایک لاکھ گنا؛ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے، (۲) اگر کسی کی عمر حضرت نوح علیہ السلام کے برابر بھی ہو تو مسجد حرام کی صرف ایک نماز باجماعت اس کی تمام عمر کی نمازوں سے افضل ہوگی، (۳) کیا ایک مسلم حرم پاک کی اس قدر اجر والی نماز کے لئے سفر کر کے نہیں آ سکتا؛ یقیناً آ سکتا ہے اور یہ اس کی خوش نصیبی ہے، چاہے وہ طواف کرے (یہاں کا ادب یہ ہے کہ تحیۃ الحرام کے طور پر طواف کیا جائے، جس طرح دیگر مساجد کے لئے دوگانہ ہے) یا اعتکاف کرے، یا نماز پڑھے یا ذکر و تلاوت کرے؛ بلکہ ایک مومن کا دل صرف کعبۃ اللہ شریف کو دیکھنے کے لئے بھی بے چین و بے تاب رہتا ہے اور مسلسل دیکھتے رہنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، کیا خوب کہا کسی نے کہ کعبۃ اللہ کو دیکھتے رہنا ''نماز دید'' ہے :

وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت
مسلسل ہے پیش نظر اللہ اللہ

صرف طواف و نماز کے لئے یا اعتکاف کی نیت سے حاضر ہونے کے لئے احرام کی ضرورت نہیں اور اس کا اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ احرام تو حج وعمرہ کے لئے ہے۔

(۴) حدود حرم میں شکار کھیلنا، حرم کے درخت کاٹنا، حرم کی گھاس جانور کو چرانا حرام ہے۔ (۴)

ان حدود میں جنگ وقتال کی اجازت نہیں، اس محترم علاقہ میں ان سب چیزوں کو ادب واحترام کے خلاف گنہگارانہ جسارت قرار دیا گیا ہے۔ (۵)

---

(۱) مسند احمد بحوالہ معارف الحدیث۔ (۲) معارف الحدیث۔
(۳) معلم الحجاج۔ (۴) معلم الحجاج۔
(۵) معارف الحدیث۔

ان هذا البلد حرمه الله يوم خلق السموات والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيمة وأنه لم يحل القتال فيه لاحد قبلى ولم يحل لى الاساعة من نهارٍ ۔ (۱)

یہ شہر مکہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے قیامت تک کے لئے اس کا ادب واحترام واجب ہے اور مجھ سے پہلے اللہ نے اپنے کسی بندے کو یہاں قتال فی سبیل اللہ کی بھی اجازت نہیں دی اور مجھے بھی دن کے تھوڑے سے وقت کے لئے اس کی عارضی اور وقتی اجازت دی گئی تھی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ ''کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار اُٹھائے۔(۲)

فتح مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے دین کی اہم مصلحت اور بیت اللہ کی نظیر کی خاطر صرف چند گھنٹوں کے لئے حرم میں قتال کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی اور فتح کے بعد آپ ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اعلان واظہار فرمایا کہ یہ اجازت صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے تطہیر بیت اللہ کی غرض سے تھی اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لئے تھی، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام ہے اور میرے لئے بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے حلال ہوا تھا پھر حرام کردیا گیا، (معارف القرآن جلد دوم) حرمت حرم کی اس بحث میں احرام کا کہیں ذکر نہیں، احرام اس کی حرمت کی شرط نہیں ہے؛ بلکہ ایک خاص عبادت (حج وعمرہ) کے لئے ضروری ہے۔

(۵) حج وعمرہ کی نیت سے آنے والوں کے لئے میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے، ذیل کی حدیث میں میقات کے تعین کے ساتھ بہت واضح ہے کہ جو حج وعمرہ کا ارادہ رکھتا ہے، وہ میقات سے احرام باندھے، (ورنہ نہیں)۔

عن ابن عباسؓ قال وقت رسول الله صلى الله عليه وسلم لما هل المدينة ذالحليفه ولا هل الشام الجحفة ولا هل نجد قرن المنازل ولا هل اليمن يلملم فهن لهن ولمن اتى عليهن من غير اهلهن لمن كان يريد الحج والعمرة فمن كان دونهن فمهله من اهله وكذاک يذاک حتى اهل مكة يهلون منها ۔ (۳)

---

(۱) بخاری ومسلم، بحوالہ معارف الحدیث، جلد پنجم۔ (۲) معارف الحدیث، جلد چہارم، بحوالہ: صحیح مسلم۔
(۳) بحوالہ معارف الحدیث، جلد چہارم، بحوالہ بخاری ومسلم۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذوالحلیفہ کو اہل مدینہ کا میقات مقرر کیا اور جحفہ کو اہل شام کا اور قرن المنازل کو اہل نجد کا اور یلملم کو اہل یمن کا، پس یہ چاروں میقات خود ان کے رہنے والوں کے لئے میقات ہیں اور ان سب لوگوں کے لئے جو دوسرے علاقوں سے ان مقامات پر ہوتے ہوئے آئیں، جن کا ارادہ حج یا عمرہ کا ہو، پس جو لوگ ان مقامات کے بعد کے ہوں (مکہ معظّمہ کی طرف) تو وہ اپنے گھر ہی سے احرام باندھیں گے اور یہ قاعدہ اسی طرح چلے گا، یہاں تک کہ خاص مکہ کے رہنے والے مکہ ہی سے احرام باندھیں گے۔

صحیح مسلم میں ''**باب جواز دخول مكة بغير الاحرام**'' کے تحت تین احادیث بیان کی گئی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ فتح مکہ موقع پر رسول اللہ ﷺ کے سر پر خود اور سیاہ عمامہ تھا: **وعليه عمامة سوداء**، (مسلم شریف جلد سوم) اوپر کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احرام اس وقت ضروری ہے جب حج یا عمرہ کا ارادہ ہو، احادیث میں ''**ممن أرادا الحج والعمره**'' یا ''**لمن كان يريدالحج والعمرة**'' یا ''**ممن كان يريدالحج والعمره**'' کے صاف الفاظ آئے ہیں، اس صریح دلیل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی عملی مثال بھی اس کی تائید میں موجود ہے کہ آپ ﷺ بغیر احرام (فتح مکہ کے موقع پر) مکہ میں داخل ہوئے تھے۔

(۶) جمہور (شوافع، مالکیہ اور حنابلہ) کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ جو لوگ حج وعمرہ کے ارادے سے سے حرم نہ آئے ہوں، ان کے لئے احرام باندھ کر آنا مستحب اور مسنون ہے، نہ کہ واجب اور موجب دم۔(۱)

صاحب تاتارخانیہ مسلک شافعی کے قول مشہور کو لکھتے ہیں:

إنـمـا يـلـزم الإحرام إذا أراد دخول مكة للحج أو للعمره أما إذا كان للآخر فلا يلزم۔ (۲)

بے شک احرام تو اس پر لازم ہے جو حج یا عمرہ کے ارادے سے مکہ میں داخل ہو، اگر کسی اور وجہ سے داخل ہو تو اس پر لازم نہیں۔

(۷) شیخ عبدالعزیز بن بازؒ (سابق مفتی اعظم سعودی عربیہ) ''فتاویٰ مہمہ تتعلق بالحج والعمرۃ'' میں ''کیا حکم ہے اس کے لئے جو حج وعمرہ کے علاوہ ارادہ سے میقات سے تجاوز کرے؟'' کے جواب میں لکھتے ہیں:

---

(۱) عرض مسئلہ: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مجلّہ حج وعمرہ: ۴۲، سطر: ۱۴۔

(۲) مضمون: مولانا محمد قمرالزماں ندوی، مجلّہ حج وعمرہ: ۴۵۴۔

إنما جاء لمكة للبيع أو الشراء أو لزيارة بعض أقاربه وأصدقائه أو لغرض آخر و لم يرد حجاً ولا عمرة فهذا ليس عليه إحرام على الصحيح ، وله أن يدخل بدون إحرام ، هذا هو الراجح فى قولى العلماء والأفضل انه يحرم بالعمرة ليغتنم الفرصة ۔

یہ فتویٰ ظاہر کرر ہا ہے کہ حج وعمرہ کے علاوہ کسی اورغرض کے لئے مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہو سکتے ہیں، موقع کوغنیمت جان کرعمرہ کرلےتو بہتر ہے، یہ فرد کی صوابدید پر ہے۔

اس وقت حرمین شریفین کی نگرانی اورانتظام حکومت سعودی عربیہ کی ذمہ داری ہے، جہاں پر نماز کا نظام قائم ہےاورشریعت اسلامیہ کے نفاذ کا اعلان عام ہے، چار ائمہ میں سے تین کے ہاں نرمی ہے،اس لئے حاکم کی حکومت کے مفتی کا فتویٰ خلاف شرع نہیں اور حاکم کا حکم مسائل مجتہد فیہ میں اختلاف کوختم کر دیتا ہے۔

إن حكم الحاكم رافع للخلاف فى الأمور المجتهد فيها ۔ (۱)

(۸) اس پر اُمت کا اجماع ہے کہ حج عمر میں ایک مرتبہ صاحب استطاعت مسلمان پر فرض ہے؛ البتہ عمرہ سے متعلق اختلاف ہے کہ یہ عمر میں ایک مرتبہ حج کی طرح فرض ہے یا سنت مؤکدہ؟ عام طور پر سے میقات سے باہر رہنے والے جب حج کی نیت سے مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں تو وہ تمتع کرتے ہیں یا قران،اوران دونوں طریقہ حج میں عمرہ ادا ہوجاتا ہے، مالکیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ عمرہ کرنا سنت مؤکدہ ہے،فرض نہیں ہے،ابن ماجہ کی روایت:''الحج مکتوب والعمرۃ تطوع'' سے وہ استدلال کرتے ہیں:''وأتموا الحج والعمرة لله ''(۲) میں کہا گیا ہے کہ جب نیت کروتو پورا کرو چاہے وہ نفلی ہی کیوں نہ ہواور یہ صرف خالصتاً للہ ہو۔

ایک مسلمان جوحج وعمرہ کی فرضیت سے فارغ ہو چکا ہوتو اب اس پر حج یا عمرہ کیوں کرفرض ہوسکتا ہے، وہ اپنی سہولت اورموقعہ سے جتنے چاہے حج وعمرہ کرلے؛ لیکن یہ شرط عائد کرنا کہ جب بھی وہ داخل مکہ مکرمہ ہونا چاہتا ہے، لازماً احرام باندھے ایک اضافی فرضیت لگتی ہے، یا تو وہ شخص اپنے لئے اضافی حج وعمرہ میں حرج محسوس کرے گا یا ارادہ نہ ہونے پر حرم مکی آنے میں تکلف کرے گا اور حاضری سے محروم رہے گا، جومناسب نہیں، یہی بات سبل السلام کے حوالہ سے جناب خورشید احمد اعظمی ، (۳) نے لکھی ہے کہ اگر ہر مرتبہ کے دخول مکہ پرعمرہ یا حج کے احرام کو واجب کہا جائے،تو حج یا عمرہ کا عمر میں کئی دفعہ واجب یا فرض ہونا لازم آئے گا، جومتفق علیہ مسئلہ کے خلاف ہے۔

---

(۱) مضمون: مفتی شبیر احمد قاسمی، مجلّہ حج وعمرہ:۹ /۱۷، بحوالہ تکملہ فتح الملہم۔

(۲) البقرۃ:۱۹۶۔ (۳) مجلّہ حج وعمرہ:۳۰۶۔

(۹) عبادات کی جان ''خشوع وخضوع'' ہے، یہ نہ ہوتو عبادت بے اثر ہوکر رہ جاتی ہیں؛اس کے لئے دل کی آمادگی انتہائی ضروری ہے،نوافل کے لئے اختیار نہ دیا جائے تو وہ عبادت کو بوجھ سمجھتا ہے،ایسے حج وعمرہ کا کیوں کر اجر ملے گا جس کے لئے دل میں آمادگی نہیں اور اگر اسے اپنے صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو اس کے جذبات وکیفیات حرم کے شایان شان رہنے میں مددگار ہوں گے۔

(۱۰) فقہاء احناف میقات کے اندر رہنے والوں کو (حرج ومشقت کی رعایت کرتے ہوئے) بغیر احرام کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں،(۱) اس اجازت کی روشنی میں غور فرمایئے :

سَوَاء الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۔ (۲)

برابر ہے اس میں رہنے والا اور باہر سے آنے والا۔

(الف) جو رخصت وسہولت میقات کے اندر والوں کے لئے ہے، وہی رخصت باہر والوں کو بھی ہونی چاہئے؛اس لئے کہ دونوں برابر ہیں اور دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔

(ب) مدینہ منورہ سے آنے والوں کے لئے میقات ذوالحلیفہ ہے، چند سال پہلے تک یہ میقات شہر سے دور تھی؛لیکن اب آبادی بڑھتے بڑھتے میقات سے اندر (مکہ مکرمہ کی جانب) آگئی ہے، جو اشخاص میقات کے اندر رہتے ہیں، وہ بغیر احرام جائیں گے اور جو تھوڑے ہی فاصلے پر میقات کے باہر ہیں، وہ احرام میں جائیں گے، میقات کے باہر والوں کے لئے احرام کی شرط حرج پیدا کرے گی، جب کہ اس کا پڑوسی ساتھی چند گز کے فاصلے پر میقات کے باہر ہے، وہ احرام جائے گا، میقات کے باہر والوں کے لئے احرام کی شرط حرج پیدا کرے گی؛جب کہ (ایک ہی شہر ہونے کی وجہ سے) لوگ مل کر ایک گاڑی میں جائیں،اس کا آسان حل توسع اختیار کرنے میں ہے۔

(ج) بحرین، دمام، ریاض وغیرہ سے جدہ جانے والے لوگ مکہ مکرمہ کے راستہ سے ہوتے ہوئے جاتے ہیں اور بعض وقت مکہ مکرمہ کے قریب آکر راست جدہ جانے کے بجائے کچھ دیر کے لئے مکہ مکرمہ میں رُک جاتے ہیں،(عبور کرنے کی اجازت تو ملنی چاہئے،سورۂ نساء کی آیت:۴۳، الا عابری سبیل کی روشنی میں) اسی اثناء کبھی حرم مکی کے قریب جگہ ملتی ہے اور پیاری اذان سن کر حرم مکی کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، وہ چوں کہ میقات کے باہر سے چلے ہیں اور حرم میں داخل ہورہے ہیں، اگر احرام کی شرط عائد کی جائے تو وہ یا تو حرم نہ جائیں یا چلتے ہوئے احرام کی حالت میں چلیں یا داخل حرم ہونے کی وجہ سے دم دیں، مناسب نہیں لگتا، مسئلہ کا حل توسع میں ہے۔

---

(۱) مجلّہ حج وعمرہ:۱۲۶، ۲۱۷، ۳۳۱ وغیرہ۔

(۲) الحج:۲۵۔

(د) مکہ مکرمہ ماشاءاللہ کافی بڑا شہر ہے اور تجارتی اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے، اندرون و بیرون ملک سے بے شمار لوگ آتے جاتے ہیں، ہر آنے والا عمرہ ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہوتا، اس پر عمرہ کی شرط عائد کرنا اس کے لئے کھلا حرج ہے، ایسی صورت میں اس کی سہولت اور صورتحال کے مطابق اس کی صوابدید پر چھوڑنا مناسب ہے۔

(ھ) آج کل زائرین کا اژدہام کافی ہو چلا ہے؛ اسی لئے حکومت سعودی عربیہ نے انتظامات کی خاطر سعودیہ میں مقیم مسلمانوں کو ہر سال حج کرنے سے روکا ہے اور فقہ اکیڈمی نے اس کی صحیح تائید کی ہے، اگر ہر آنے والا عمرہ کرے گا تو سال تمام اژدہام رہے گا اور پہلی دفعہ آنے والے، یا صرف عمرہ کی غرض سے آنے والے معتمرین کو بجاطور پر تکلیف ہوگی، زائرین حرم کی راحت کے لئے میقات کے باہر مقامی حضرات کا عمرہ نہ کرنا بہتر ہوگا۔

(و) امام غزالی نے احیاء العلوم میں ابن حاکم کے حوالہ سے بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ لکھا ہے کہ ''خانہ کعبہ کا طواف بہت کیا کرو کہ وہ بڑی بزرگ چیزوں میں سے ہے'' اور بیہقی کے حوالہ سے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما لکھا ہے کہ ''اس گھر پر (حرم مکی) ہر روز ایک سو بیس رحمتیں اترتی ہیں، ساٹھ طواف کرنے والوں کے لئے، چالیس نماز پڑھنے والوں کے لئے اور بیس اس کو دیکھنے والوں کے لئے'' لہٰذا عمرہ کرنا ضروری نہ قرار دیا جانا چاہئے۔

(ی) توسع اختیار کرنے میں مکہ کے رہنے والوں کے لئے اشہر حج میں میقات کے باہر سے آنے میں کوئی دشواری نہیں رہے گی۔ (مجلّہ حج وعمرہ: ۵۷)

کثرت سے لوگ بعد عمرۂ تمتع مدینہ طیبہ جاتے ہیں، امام صاحب (یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ) کے قول پر واپسی میں عمرہ کرنا واجب ہے، اگر احرام والی شرط عائد کی جائے تو ہر مدینہ طیبہ جانے والے حاجی کو احرام ساتھ رکھنا ہوگا؛ تاکہ واپسی میں وہ احرام باندھ کر مکہ مکرمہ پہنچے اور جو لوگ بھول جائیں وہ دم دیں، ہندوستان کے حاجی کے لئے اضافی دم دینا بہت مشکل ہے، سارے مسائل کا حل اس میں ہے کہ جو حج وعمرہ کا ارادہ رکھتا ہے، وہ احرام باندھ کر آئے، ورنہ اس کو اختیار ہے۔

(۱۱) جو لوگ احرام کے ساتھ داخل ہونے میں مشقت محسوس کرتے ہیں ان کے لئے بعض حیلے اختیار کرنے کی اجازت حنفی کتب میں مذکور ہے۔(۱)

حیلے اختیار کرنے میں جو تکلف ہے وہ ظاہر ہے (۲) مزید کہتے ہیں کہ ''حیلہ کو ایک مستقل عمل بنالینا درست

---

(۱) مثلاً: عنایہ، کفایہ اور شامی وغیرہ، ص: ۱۳۹، مجلّہ مضمون: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی۔

(۲) ص: ۱۲۶، مجلّہ مضمون: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔

نہیں لگتا، اس سے دین کے بازیچۂ اطفال بن جانے اور شریعت کے اوامر ونواہی کی بابت بے حسی و بے احترامی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے''—— لہٰذا حیلہ کو اختیار نہ کرتے ہوئے احرام کی شرط نہ عائد کرنا مناسب ہوتا ہے، جس کی واضح گنجائش ہے۔

(۱۲) موجودہ حالات میں جب تجار، دفاتر میں کام کرنے والے، ٹیکسی چلانے والے اور دیگر پیشہ وارانہ کام کرنے والے کبھی ہر روز، کبھی ہر دوسرے تیسرے دن اور بعض لوگوں کو ایک دن میں ایک سے زیادہ دفعہ حرم میں داخل ہونا پڑتا ہے، ایسی حالت میں اس طرح کے لوگوں کو ہر بار احرام اور اداء عمرہ کی پابندی بے حد مشقت طلب اور دشوار ہے، اس لئے ان حضرات کے لئے بغیر احرام باندھے حدود حرم میں داخلہ کی گنجائش ہوگی، (۱) بے شمار افراد ان گنت ضرورتوں کے تحت صبح شام مختلف حیثیتوں اور شکلوں میں آتے جاتے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا، ہم کسی صورت آنے جانے والوں کے بار بار داخل ہونے کو کسی ضابطہ میں محدود نہیں کر سکتے، کسی کو رخصت دینا کسی کو نہ دینا ایک مشکل کام ہو کر رہ جائے گا، اوپر کے فیصلہ کو تسلیم کرنے والے دو علماء میں رخصت دینے نہ دینے کے معاملہ میں اختلاف ہونا یقینی ہے، جو حرج بار بار آنے والا محسوس کرتا ہے، وہی حرج کبھی کبھی آنے والا بھی محسوس کرتا ہے، ان ساری دشواریوں کا بہترین حل یہی ہے کہ جو حج وعمرہ کا ارادہ رکھتا ہو وہ احرام باندھے ورنہ ہر وہ شخص جو داخل حرم ہونا چاہتا ہے وہ حرم کے شایان شان اپنے جذبات کو حرم کی تاریخ ودرس سے ہم آہنگ کر کے آتا جاتا رہے:

- إِنِّـیْ وَجَّـهْـتُ وَجْهِـیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِیْفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ (۲)

میں نے متوجہ کرلیا، اپنے منھ کو اسی کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین سب سے یکسو ہوکر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا۔ (۳)

- إِنَّ صَلاَ تِـیْ وَنُسُـکِـیْ وَمَـحْـیَـایَ وَمَـمَا تِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَـالَـمِیْنَ ، لاَ شَرِیْکَ لَهُ وَبِذٰلِکَ أُمِرْتُ وَأَنَاْ أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ (۴)

تو کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہاں کا ہے، کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔ (۵)

---

(۱) فیصلہ نمبر:۲ بابت حج وعمرہ کے مسائل، مجلّہ حج وعمرہ۔ (۲) الانعام:۷۹۔
(۳) معارف القرآن۔ (۴) الانعام:۱۶۲-۱۶۳۔
(۵) معارف القرآن۔

عبادت کی یہ روح مطلوب ومقصود ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفہ زندگی بنالے۔(۱)

اللہ تعالیٰ ہماری عبادتوں میں یہ مطلوبہ روح عطا فرمائے اور حرمین کی حاضری کے بعد بالخصوص ہماری زندگی واقعی صاف ستھری ہوجائے اور دنیا نمایاں فرق محسوس کرے کہ یہ زائرحرم اخلاق وعبادت، معاملات وکردار ہر اعتبار سے قابل احترام ہوگیا ہے۔

(۱۳) اوپر نکتہ نمبر: ۵ میں جو متفق علیہ روایت پیش کی گئی ہے، اس سے یہ بات واضح ہے کہ میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے احرام باندھنے کی جگہ ان کے گھر ہیں۔

احناف یہ کہتے ہیں کہ میقات سے بغیر احرام گزرنا منع ہے اور اس کی دلیل ''**لا یجاوز الوقت إلا بإحرام**'' دی جاتی ہے، اس حدیث میں میقات سے باہر یا اندر والوں کی صراحت نہیں ہے، جب کہ احناف صرف میقات سے باہر والوں پر احرام کی شرط عائد کرتے ہیں، اس لئے ایسی احادیث کو حج وعمرہ کرنے والوں کے حق میں ماننا زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے، حج وعمرہ کا ارادہ ہونے پر چاہے، وہ میقات سے اندر رہتا ہو یا باہر، احرام باندھ کر داخل ہوگا ورنہ نہیں، یہی بات مولانا سید اسرار الحق نے لکھی ہے۔(۲)

(۱۴) عرض مسئلہ بابت حج وعمرہ (سوال نمبر:۱،۲، ۸) کے تحت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جو خلاصہ احرام کو ضروری قرار دیئے جانے کی بابت پیش کیا ہے، اسے ہم مستحضر رہنے کے لئے نیچے لکھ دیتے ہیں؛ تاکہ تحقیق کرنے والوں کے لئے سہولت رہے۔

(الف) حضرت عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے میقات سے گذرنے والوں پر اس وقت احرام لازم قرار دیا، جب کہ وہ حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتے ہیں، (یہی حدیث اوپر نکتہ نمبر: ۵ کے تحت آچکی ہے)۔

(ب) حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب عمرہ کرکے مدینہ تشریف لائے اور قُدَید ہی میں معلوم ہوا کہ مدینہ پر فوج کشی ہوچکی ہے تو مکہ واپس گئے اور بلا احرام داخل ہوئے، اس روایت کو امام مالک اور امام محمد بسند متصل اور امام بخاری نے تعلیقاً نقل کیا ہے۔

(ج) حضرت ابوقتادہؓ کا واقعہ صحاح ستہ میں بتفصیل موجود ہے، جو مکہ حج سے متعلق دوسری ضروریات کے لئے بھیجے گئے تھے، انھوں نے میقات سے احرام نہیں باندھا تھا اور اسی لئے شکار بھی فرمایا تھا۔(۳)

(د) غزوۂ خیبر کے بعد آپ ﷺ نے حجاج بن علاط کو مکہ بھیجا ہے اور وہ بھی بلا احرام مکہ میں داخل ہوئے۔(۴)

---

(۱) معارف القرآن بحوالہ تفسیر درمنثور۔ (۲) مجلّہ حج وعمرہ: ۴۷۴۔
(۳) نیل الاوطار: ۲/ ۳۰۰۔ (۴) نیل الاوطار: ۲/ ۳۰۱۔

(ھ) احرام کا تعلق اصل میں حج وعمرہ کی عبادت سے ہے نہ کہ حرم شریف کے احترام سے، یہی وجہ ہے کہ احرام حج وعمرہ کی تکمیل ہی پر کھولا جاتا ہے، اگر احترام حرم کی بنا پر احرام ہوتا تو حل میں رہنے والوں کے لئے بھی احرام ضروری ہوتا۔

(۱۵) ہر سال حج کے موقع پر حاجیوں کی خدمت کے لئے میقات کے باہر سے (ریاض، مدینہ، دمام، تبوک وغیرہ) مختلف شعبوں سے متعلق افراد (ڈاکٹر، پولیس، ٹیکنکل افراد وغیرہ) بلائے جاتے ہیں، اگر یہ لوگ بھی احرام میں ہوں تو حاجیوں کی خدمت نہیں کر پائیں گے اور اپنی ڈیوٹی انجام نہیں دے سکیں گے، ان کا احرام نہ باندھنا حاجیوں کے حق میں بہتر ہے، اگر میقات سے باہر والوں کے لئے احرام کی شرط ضروری قرار دی جائے تو ایسے افراد محرومی کے احساس سے دل میں چبھن محسوس کرتے ہوئے حج کی خدمت انجام نہیں دے پائیں گے، جو حج کا ارادہ کرے وہی احرام باندھے ورنہ نہیں، بعض شعبے اور خدمات ایسے ہوتے ہیں کہ احرام کی حالت میں رہ کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا مشکل نہیں ہوتا؛ لیکن بعض شعبوں میں احرام کی حالت میں ہونے سے بہت حرج ومشقت ہوتی ہے؛ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احرام باندھنے کا فیصلہ اختیاری ہو، یہ بات ذہن میں آسکتی ہے کہ انتظامات کے لئے میقات کے اندر موجود افراد سے کام لیا جائے، تو عرض ہے کہ یہ شرط بہت حرج پیدا کرے گی اور جو افرادی قوت درکار ہوتی ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ افرادی قوت مطلوبہ معیار وعدد کے مطابق میقات کے اندر سے مہیا بھی ہو سکے، یہ ایسا ہوگا جیسے اندرون خاندان ہی آپس میں شادی کرنے کی شرط عائد کردی جائے۔

(۱۶) حرم مکی کی ایک شان یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی عبادت گاہ ہے :

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ ۔ (۱)

بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت جہاں کے لوگوں کو۔ (۲)

دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے، آدم وحوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کے ذریعہ ان کو یہ حکم بھیجا کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں، یہ تعمیر کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان ہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا، رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی زمانہ میں قریش نے اس کی تعمیر کی جس میں رسول اللہ ﷺ نے بھی حصہ لیا اور حجر اسود کو اپنے دست مبارک سے قائم فرمایا۔ (۳)

---

(۱) آل عمران: ۹۶۔ (۲) معارف القرآن۔ (۳) خلاصہ: معارف القرآن۔

حرم اور عبادات حرم سے متعلق جو جو غلط فہمیاں چلی آرہی تھیں، ان کی ایک ایک کر کے قرآن نے اصلاح فرمائی، قربانی کرتے تو خانہ کعبہ کی دیواروں پر خون لگائے تھے، قرآن نے نصیحت کی کہ اللہ کے پاس قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تقویٰ پہنچتا ہے، لوگ زادراہ ساتھ نہیں لیتے اور کہتے کہ ہم متوکل علی اللہ میں انھیں سمجھا گیا کہ زادراہ ساتھ لو اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے، امتیازات کی وجہ سے قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے طواف کرتے تھے، اسلام نے اس بے حیائی کو قطعاً موقوف کر کے حکم نازل فرمایا کہ ہر عبادت کے وقت زینت اختیار کرو (کپڑے پہنو)، عرفات نہ جا کر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کی اصلاح فرمائی گئی کہ جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں، وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو، اہل عرب حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں اپنے آباء واجداد کے کارنامے اور بڑائی کی باتیں کرتے تھے، اس پر یہ ہدایت نازل کی گئی کہ جس طرح پہلے اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے تھے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اب اللہ کا ذکر کرو، جاہلیت کے زمانے میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے ایک میلہ کی صورت اختیار کر لی تھی، جس میں شور وغل ہوتا، دنگا فساد ہوتا، اسلام نے ان باتوں پر گرفت کی اور حکم دیا کہ حج میں رفث وفسوق اور جدال نہ ہو، تجارت سے متعلق جو شبہ تھا، اسے دور کیا گیا کہ حج کے زمانہ میں فضل الٰہی کی تلاش میں تمہارے لئے گناہ نہیں، احرام باندھنے کے بعد گھروں میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے، کہا گیا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہو، تو اصل مقصود یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے، (۱) قرآن کی ان اصلاحات کے درمیان ہمیں احرام سے متعلق کوئی ہدایت نہیں ملتی، اگر احرام حرم مکی کے احترام کے لئے ضروری ہوتا تو لوگ جس طرح اور تعلیمات کو بھلا چکے تھے، احرام کو بھی ضروری نہ سمجھتے اور قرآن ضرور اس کے لئے متنبہ فرماتا کہ احترام کا تقاضہ ہے کہ حرم مکی میں احرام باندھ کر آئیں؛ لیکن ایسی نصیحت ہمیں قرآن میں نہیں ملتی۔

(۱۷) ایک شخص احرام باندھ کر اِفراد کی نیت کر کے (آفاقی) راست منیٰ پہنچ جاتا ہے، پہنچ جاتا ہے، وہاں سے عرفات اور مزدلفہ اور واپس منیٰ آکر رمی جمار کر کے تقصیر یا حلق کے بعد احرام کھول لیتا ہے اور غسل کر کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر طواف زیارت کے لئے حرم مکی میں داخل ہوتا ہے، یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حج کی نیت کے ساتھ میقات پر احرام باندھ کر آیا، حج کے مناسک ادا ہوئے اور حرم مکی کی حاضری بغیر احرام میں ہو رہی ہے، اس پر کوئی دم نہیں، اگر یہ احترام حرم کے منافی نہیں ہے تو عام حالات میں بھی میقات سے باہر رہنے والا بغیر احرام باندھے طواف کر سکتا ہے اس کو احرام اس وقت باندھنا ضروری ہوگا، جب وہ عمرہ یا حج کرنا چاہتا ہو۔

---

(۱) خلاصہ: سیرت النبی ﷺ۔

(۱۸) جوحضرات میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے احرام کوضروری قرار دیتے ہیں،ان کی دلیل مصنف ابن ابی شیبہ کی مختلف روایتیں ہیں،جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بغیر احرام میقات سے نہ تجاوز کرے،مصنف ابن ابی شیبہ کی اس موضوع پر ذکر کردہ احادیث کی تحقیق کے لئے ہم نے مولانا شعیب اسلم ندوی ازہری سے گذارش کی،ہم ذیل میں ان کی تحقیق کا خلاصہ لکھتے ہیں۔

(الف) یہ کتاب ''مصنف ابن ابی شیبہ'' جیسا کہ اس کے ٹائٹل سے واضح ہے،حدیث کے ساتھ ساتھ آثار اور تابعین وتبع تابعین کے استنباطات پر بھی مشتمل ہے،اس کی حیثیت سنن کی نہیں ہے۔

(ب) اکثر علماء جو مکہ میں بغیر احرام کے داخلہ پر پابندی کے قائل ہیں،ان کا انحصار مصنف ابن ابی شیبہ کی حدیثوں پر ہیں یا بخاری ومسلم کی احادیث کی تاویل پر مبنی ہے،ابن ابی شیبہ کی حدیثیں اس معیار کی نہیں ہیں کہ اس کی بنیاد پر یہ حکم ثابت کیا جائے۔

(ج) ''**لا يجاوز أحد الوقت إلا المحرم**'' یہ روایت ضعیف اور مرسل ہے،سند کے اعتبار سے اس لئے ضعیف ہے کہ اس کے ایک راوی عبدالسلام بن حرب کو اگرچہ کہ ابن حجر نے ''ثقہ حافظ'' کہا ہے،مگر ساتھ ہی لکھا ہے کہ ان سے منکر روایتیں بھی کافی ہیں،حافظ کمزور ہے،سعید بن جبیر اگرچہ ثقہ ہیں،مگر حدیث مرسلاً ذکر کی ہے (عرض مسئلہ سوال نمبر:۱،۲،۸ کے تحت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بھی اس روایت کے مرسلاً ذکر کرنے کی تصدیق کی ہے)۔

(د) ''**لا يجاوز أحد ذات عرق حتىٰ يحرم**'' یہ روایت بھی ضعیف اور مرسل ہے،ضعیف اس لئے کہ اس میں ''شریک'' ہیں،جن کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے کئی علماء کے اقوال کو سامنے رکھ کر کہا ہے ''**صدوق يخطئ كثيراً**'' ——اور ایک راوی عطاء صدوق ہیں،مگر ان کو وہم بہت ہوتا ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔

(ھ) ''**إذا جئت من بلد آخر فلا تجاوز الحد حتى تحرم**'' یہ روایت بھی ضعیف ہے کہ اس میں ایک راوی ابن فضیل (محمد بن فضیل) غالی شیعہ ہے اور روایت مجاہد (تابعی) تک ہی پہنچتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ عملاً مکہ مکرمہ کی حاضری سے مشرف ہوتے رہتے ہیں،ان کے لئے ہر بار داخل ہوتے ہوئے عمرہ کرنا آسان نہیں ہوتا،وقت کے علاوہ اژدحام اور بہت سی دشواریاں درپیش ہوتی ہیں،اس لئے علماء ہند وپاک کو غور کرنا چاہئے کہ کیا اس مسئلہ میں جمہور کی رائے سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا،جس کی پشت پر رسول اللہ ﷺ کا عمل بھی موجود ہے؟

○ ○ ○

زوجین میں سے ایک کی میڈیکل رپورٹ سے دوسرے فریق کو باخبر کردینا

خالد سیف اللہ رحمانی

شریعت اسلامی میں انسانی عزت وآبرو کو بے حد اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ اسی مقصد کے لئے حد قذف رکھی گئی ہے؛ تاکہ ایک شخص دوسرے شخص کے خلاف بہتان تراشی نہ کرسکے، کسی کی عزت وناموس سے کھیلنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس کے معائب کا چرچا کیا جائے، اسی کو اصطلاح میں 'غیبت' کہتے ہیں، غیبت کبیرہ گناہوں میں سے ہے؛ یہاں تک کہ قرآن مجید نے غیبت کرنے کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے :

> یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا کَثِیْراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَب بَّعْضُکُمْ بَعْضاً أَیُحِبُّ أَحَدُکُمْ أَن یَأْکُلَ لَحْمَ أَخِیْهِ مَیْتاً فَکَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوْا اللہ ، إِنَّ اللہ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ۔ (١)
>
> اے ایمان والو! بہت سارے گمان سے بچو! کہ بعض گمان (بدگمانی) گناہ ہے اور ٹوہ میں نہ پڑا کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہوگی کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والے مہربان ہیں۔

غیبت کی حقیقت

غیبت کیا ہے؟ —— اس کی تشریح خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے :

عن أبی هریرة رضی اللہ عنه أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال :

---

(١) الحجرات:١٢۔

أتدرون ما الغيبة ؟ قالوا : الله ورسوله أعلم ، قال : ذكرك أخاك بما يكره ، قيل : أفرأيت إن كان في أخي ما أقول ؟ قال : إن كان فيه ما تقول فقد أغتبته ، وإن لم تكن فيه فقد بهته ، أخرجه مسلم في صحيحه ۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم کو معلوم ہے کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے غرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کے بارے میں ایسی بات نقل کرنا، جو اس کو ناپسند ہو، دریافت کیا گیا: اگر میرے بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہوں تو آپ ﷺ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر اس کے اندر تمہاری کہی ہوئی بات موجود ہو تبھی تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات موجود نہ ہو، تب تو تم نے بہتان تراشی کی۔

''**فليكره**'' (جو اسے ناپسند ہو) میں تمام معائب داخل ہیں، چاہے ان کا تعلق دین سے ہو یا خَلق سے، اور خُلق سے ہو یا حسب و نسب سے، علامہ قرطبی اور جمہور علماء نے غیبت کے سلسلے میں اسی عموم کو ترجیح دی ہے اور رسول ﷺ کا ارشاد: ''**ذكرك أخاك بما يكره**'' کے الفاظ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے(۲) اس لحاظ سے کسی انسان کے جسمانی عیب کو بیان کرنا بھی غیبت میں داخل ہے، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت عائشہ ﷺ نے حضرت صفیہ ﷺ کے بارے میں کہا ہے: ''**انها امرأة قصيرة**'' اور حضور ﷺ نے ان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''**لقد قلت كلمة لو مُزِجت بماء البحر لمَزَجَتْه**'' (۳) یعنی تم نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ اگر اس کو سمندر کے پانی میں ملا دیا جائے تو اسے بھی خراب کردے — کسی انسان کا پست قامت ہونا بھی ایک خلقی عیب ہے اور کسی شخص کا بیمار ہونا بھی ایک خلقی عیب ہے؛ لہٰذا خلقی عیب کو ظاہر کرنا بھی غیبت میں داخل ہے۔

کب غیبت کرنا جائز ہے؟ حدیث کی روشنی میں

اس کے مقابلہ بعض ایسی روایات بھی موجود ہیں، جن میں آپ ﷺ کے سامنے کسی شخص کی کمی کو بیان کیا گیا اور آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، حضرت ہندہ ﷺ نے آپ ﷺ سے عرض کیا :

(۱) کتاب البر والصلة والادب ، باب تحريم الغيبة، حدیث نمبر:۶۷۵۸۔

(۲) دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱۶/۳۲۷۔ (۳) ابوداؤد، کتاب الادب، حدیث نمبر: ۴۸۷۵۔

إن أبـا سـفيـان رجل شحيح لا يعطيني ما يكفيني أنا وولدي فآخذ من غير علمه ؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم : نعم فخذي ۔ (۱)

ابوسفیان رضی اللہ عنہ بخیل آدمی ہیں، مجھے اتنا نہیں دیتے جو مجھ کو اور میرے بچہ کو کافی ہوجائے، تو کیا میں ان کو بتائے بغیر (ان کے مال میں سے) لے سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: ہاں (اگرایسا ہے تو) لے لیا کرو۔

اسی طرح معروف روایت ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا جو بڑی خوبصورت ، دانش منداور باکمال خاتون تھیں، جب ان کو حفص ابن مغیرہ رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ابوجہم رضی اللہ عنہ دونوں نے نکاح کا پیغام دیا، انھوں نے حضور ﷺ سے مشورہ کیا، آپ ﷺ نے ان دونوں رشتوں کو ردفرماتے ہوئے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے نکاح کا مشورہ دیا، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا :

أمـا مـعـاوية ، فـصـعـلوك لا مال له وأما أبو جهم فلا يضع عصاه عن عاتقه ۔ (۲)

معاویہ یہ تو بہت غیرب ہیں ، ان کے پاس مال نہیں ہے (کہ تمہارے حقوق ادا کرسکیں)اوراپنی لاٹھی کاندھے سے نیچے رکھتے ہی نہیں (یعنی پار پیٹ کرتے ہیں)۔

اسی طرح ایک صاحب جو آپ ﷺ کی طرف آرہے تھے، آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی اخلاقی کمزوری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ’’**بئس أخو العشيرة**‘‘۔(۳)

غیبت جائز ہونے کے مواقع اور فقہاء کی تصریحات

ان دونوں طرح کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے لکھا ہے کہ غیبت اصل میں تو گناہ ہے، خواہ اس کا تعلق دین سے ہو، اخلاق سے ہو، جسمانی عیوب سے ہو، یا حسب ونسب سے ہو؛ لیکن بعض مستثنیات ہیں کہ جن میں کسی اہم تر مصلحت کی بنیاد پر غیبت کی اجازت دی گئی ہے، مفسرین ، شارحینِ حدیث اور فقہاء نے اُن صورتوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، جن میں کسی مسلمان کے عیوب کو ظاہر کرنے کی گنجائش ہے، امام غزالی رحمہ اللہ

(۱) ابوداؤد ، كتاب الإجاره ، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده، حدیث نمبر:۳۵۳۴۔

(۲) ترمذی ، كتاب النكاح ، باب ماجاء ان لا يخطب على خطبة اخيه، حدیث نمبر:۱۱۳۴۔

(۳) رواه الترمذي ، كتاب البر والصلة باب ماجاء في الاقتصاد في الحب والبغض، حدیث نمبر:۱۹۹۶، وفيه استاذن رجل على رسول الله صلى الله ﷺ وانا عنده فقال ابن العشيرة او اخو العشيرة ثم اذن له۔

نے اپنی شہرہ آفاق تالیف ''إحیاء علوم الدین'' میں چھ اسباب کا ذکر کیا ہے، جن کی وجہ سے غیبت کرنے کی گنجائش ہے، (۱) امام نووی نے بھی الفاظ کے فرق کے ساتھ ان ہی اسباب کا ذکر فرمایا ہے :

إعلم أن الغيبة وإن كانت محرمة فإنها تباح في أحوال للمصلحة والمجوز لهذا غرض صحيح شرعي لا يمكن الوصول إليه إلا بها وهو أحد ستة أسباب ۔ (۲)

جان لو کہ غیبت اگر چہ حرام ہے ؛ لیکن بعض حالات میں مصلحت کی بنا پر اس کی اجازت ہے اور اجازت کا سبب وہ صحیح شرعی مقصد ہوگا، جس کو اس کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا اور وہ چھ اسباب میں سے کوئی ایک ہے۔

قریب قریب ان ہی اسباب کا ذکر امام نووی ؒ نے ''أسنی المطالب فی شرح روضۃ الطالب'' میں بھی کیا ہے (۳/۱۱۷) فقہ حنبلی کی معروف کتاب (۳) میں بھی امام غزالی اور امام نووی ؒ کے حوالہ سے یہی چھ اسباب ذکر کئے گئے ہیں، اس سلسلے میں تمام صورتوں کا احاطہ علامہ ابن عابدین شامی ؒ نے کیا ہے اور انھوں نے گیارہ مواقع ذکر کئے ہیں، جن میں غیبت کرنا گناہ کے دائرہ میں نہیں آتا اور ان کو تین اشعار میں نظم بھی کیا ہے، (۴) فقہاء نے اس سلسلے میں مختلف جزئیات بھی ذکر کی ہیں، جیسے فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے :

وفي الحاوي : سئل عمن رأى رجلا يسرق مال إنسان قال : إن كان لا يخاف الظلم منه يخبر به وإن كان يخاف ترك ۔ (۵)

حاوی میں ہے: ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو کسی شخص کو دوسرے کا مال چوری کرتے ہوئے دیکھے؟ جواب دیا: اگر اس کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی اطلاع دیدے اور اندیشہ ہو تو چھوڑ دے۔

یہاں تک کہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص عبادت کا پابند ہو؛ لیکن لوگوں کو ضرر پہنچاتا ہو تو اس کی کوتاہی کو بھی بیان کرنے میں حرج نہیں :

ولو كان الرجل يصلي ويضر بالناس باليد واللسان لا غيبة في ذكره بما فيه ۔ (۶)

---

(۱) دیکھئے: إحیاء علوم الدین: ۳/۱۱۲۔ (۲) الأذکار: ۴۲۹۔ (۳) الاقناع: ۲/۷۷۔

(۴) دیکھئے: ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء: ۹/۵۹۷۔

(۵) الفتاویٰ التاتارخانیہ: ۱۸/۱۹۵۔ (۶) المحیط البرہانی: ۲۵/۲۸، نیز دیکھئے: الفتاویٰ التاتارخانیہ: ۱۸/۲۳۲۔

اگر کوئی شخص نماز بھی پڑھا کرتا ہو اور لوگوں کو ہاتھ اور زبان سے نقصان بھی پہنچاتا ہو تو جو بات اس میں موجود ہو اس کا ذکر کرنا غیبت (کے گناہ میں) شامل نہیں۔

اگر چہ غیبت کی مباح شکلوں کو شارحین حدیث اور فقہاء نے چھ سے گیارہ تک ذکر کیا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو ان سب میں بنیادی تین باتیں ہیں، ایک: یہ کہ کوئی شخص مظلوم ہو اور اسے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ظالم کی صورت حال لوگوں کے سامنے بتانی پڑے، دوسرے: کسی مسلمان کے ضرر کو دور کرنا مقصود ہو، تیسرے: کسی مسلمان کی اصلاح مقصود ہو؛ چنانچہ اکثر فقہاء کے یہاں اس کی صراحت ملتی ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں :

الرابع : تحذير المسلم من الشر فإذا رأيت فقيها يتردد إلى مبتدع أو فاسق وخفت أن تتعدى إليه بدعته وفسقه ، لک أن تكشف له بدعته وفسقه ۔ (۱)

چوتھی صورت: مسلمان کو شر سے بچانے کی ہے؛ لہٰذا جب تم کسی فقیہ کو دیکھو کہ وہ کسی بدعت کرنے والے یا فاسق شخص کے پاس آمد و رفت رکھتا ہو اور تم کو ڈر ہو کہ اس کی بدعت اور معصیت شعاری اس شخص پر بھی اثر انداز ہو جائے گی تو تمہارے لئے جائز ہے کہ اس کے صاحب بدعت اور فاسق ہون کے کو ظاہر کردو۔

ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں :

...... إذا كانت للنصيحة أو لدفع المفسدة لم تمنع ولو أن شخصا اطلع من آخر على قول يقتضي إيقاع ضرر بإنسان ، فإذا نقل إليه ذلک القول احترز عن ذلک الضرر لوجب ذكره له ۔ (۲)

......غیبت نصیحت یا مفاسد کو دور کرنے کے لئے ہو تو ممنوع نہیں ہے اور اگر کوئی شخص دوسرے کی ایسی بات پر مطلع ہو جائے، جس کا تقاضا دوسرے کو ضرر پہنچانا ہے، نیز اگر یہ بات وہ اس سے نقل کردے تو وہ اس ضرر سے بچ سکتا ہو تو واجب ہے کہ وہ اس سے اس کا تذکرہ کردے۔

علامہ نوویؒ اُن اسباب کا ذکر کرتے ہوئے جن کی وجہ سے غیبت کی گنجائش ہے، فرماتے ہیں :

تحذير المسلمين من الشر ونصيحته ۔ (۳)

---

(۱) إحياء علوم الدين:۱۵۲/۳۔

(۲) إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام:۱۰۵/۱۔ (۳) الأذكار:۴۳۰۔

مسلمانوں کوشر سے بچانا اوران کے ساتھ خیرخواہی کرنا۔

بلکہ فقہاء کی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر مسلمانوں کوضرر سے بچانے کے لئے غیبت واجب بھی ہوجاتی ہے؛ چنانچہ بقول علامہ ابن عابدین الشامیؒ :

الإباحة لا تنافی الوجوب فی بعض المواضع الأ تیه إلخ ۔ (۱)

غیبت کا مباح ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ آگے ذکر کئے جانے والے بعض مواقع میں وہ واجب قرار پائے۔

یوں تو بہت سی جہتوں سے انسان کو ایک دوسرے سے ضرر پہنچ سکتا ہے، کسی مبتدع شخص کے پاس آمد ورفت سے، کاروبار اور معاملات میں کسی کو اپنا ساتھی بنانے سے؛ لیکن ازدواجی زندگی کا تعلق ایسا تعلق ہے، جس میں زوجین کا ایک دوسرے سے سب سے زیادہ سابقہ ہوتا ہے، دوسرے لوگوں سے مالی یا اخلاقی تعلق ہوتا ہے؛ لیکن شوہر و بیوی کے درمیان جسمانی تعلق بھی ہوتا ہے؛ لہٰذا ایک کی بیماری دوسرے فریق کے لئے ضرر کا باعث ہوتی ہے، کبھی اس طرح کہ شوہر یا بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، جس سے دوسرے فریق کو پُرسکون زندگی حاصل نہیں ہوسکتی؛ حالاں کہ یہ نکاح کے مقاصد میں سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''لِتَسۡكُنُوٓا۟ إِلَيۡهَا ''(۲) جیسے: مرد کا عنین ہونا، عورت کا ناقابل جماع ہونا، مرد وعورت میں سے کسی کا جنون، جذام، برص یا اس طرح کی بیماری میں مبتلا ہونا —— جس کو عیب سمجھا جاتا ہو اور جو دوسرے فریق کی زندگی کو بے سکون کردیتا ہو —— اسی طرح مرد یا عورت میں سے کسی میں باپ اور ماں بننے کی صلاحیت کا نہ ہونا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ہر مرد وعورت کی فطرت میں باپ اور ماں بننے کا داعیہ رکھا ہے، غرض کہ شوہر و بیوی کو ایک دوسرے سے ضرر پہنچنے کے مواقع بمقابلہ دوسرے متعلقین کے زیادہ ہیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس ؓ کو نکاح کے پیغام کے بارے میں واضح مشورہ دیا اور اس میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا؛ چنانچہ فقہاء نے عام طور پر غیبت کے مباح اسباب میں خاطب اور مخطوبہ کی کمزوریوں کے ظاہر کئے جانے کا بھی ذکر فرمایا ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں :

...... و كـذلک المستشار فی التزويج وإيداع الأمانة ، له أن يذكر ما يعرفه على قصد النصح للمستشير لا على قصد الوقيعة ، فإن علم أنه يترک التزويج بمجرد قوله : لا تصلح لک فهو الواجب وفيه الكفاية ، وإن علم أنه لا ينزجر إلا بالتصريح بعيبه فله أن يصرح به ۔ (۳)

(۱) شامی: ۵۸٦/۹۔ (۲) الروم: ۲۱۔ (۳) إحیاء علوم الدین: ۱۵۲/۳۔

......اسی طرح جس سے نکاح اور امانت رکھنے کے بارے میں مشورہ کیا جائے، اس کے لئے گنجائش ہے کہ جو جانتا ہے، اس کا ذکر کردے؛ البتہ مقصود مشورہ کرنے والے کی خیر خواہی ہو نہ کہ صرف کسی کی شخصیت کو مجروح کرنا، اگر معلوم ہو کہ صرف یہ کہہ دینے سے کہ تمہارے لئے یہ رشتہ موزوں نہیں ہے، وہ شخص رشتہ کرنے سے رُک جائے گا تو اتنا ہی کہنا واجب ہوگا اور یہ بات کافی ہوجائے گی اور اگر معلوم ہو کہ جب تک عیب کی تصریح نہ کردے، وہ متنبہ نہیں ہوگا تو اس کے لئے اس کی صراحت کردینی درست ہوگی۔

علامہ نووی ؒ فرماتے ہیں :

ومنها اذا استشارک إنسان فی مصاهرته ۔ (١)

غیبت کے جائز ہونے کی صورتوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی انسان رشتہ کرنے کے سلسلہ میں تم سے مشورہ کا طلب گار ہو۔

وللتحذیر عن عیب خاطب ومخطوبة ۔ (٢)

پیغام دینے والے کے عیب سے یا جس کو پیغام دیا جارہا ہے، اس کے عیب سے مطلع کردینا؛ تاکہ وہ بچ سکے، جائز ہے۔

علاء الدین حصکفی ؒ کا بیان ہے :

فتباح غیبة مجهول ومتظاهر بقبیح وللمصاهرة ۔ (٣)

غیر متعین شخص کی، بری باتوں کا علی الاعلان ارتکاب کرنے والوں کی، نیز رشتہ کے سلسلہ میں غیبت کرنا جائز ہے۔

خلاصۂ بحث

ان وضاحتوں کی روشنی میں یہ حقیر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ :

(الف) ایسی بیماریاں جو عام نوعیت کی ہوں یا جن سے براہ راست مقاصد نکاح متاثر نہیں ہوتے ہوں، ان سے نکاح کے دوسرے فریق کو ڈاکٹر کا اپنے طور پر مطلع کرنا یا دوسرے فریق کے مطالبے پر مطلع کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ اس فریق کے لئے قابل لحاظ ضرر کا باعث نہیں، جس سے بچانے کے لئے غیبت کی اجازت ہے۔

---

(١) الأذکار: ٤٣٠۔ (٢) أسنی المطالب فی شرح روضة الطالب: ٣/١١٧۔ (٣) الدر المختار مع الرد: ٩/٥٨٦۔

(ب) اگر زوجین میں سے ایک کسی متعدی مہلک بیماری میں مبتلا ہو تو دوسرے کو اس سے مطلع کرنا جائز ہے اور اگر دوسرا فریق اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہو تو واجب ہے؛ کیوں کہ یہ "**تحذیر المسلم من الشر والضرر**" کے دائرہ میں آتا ہے۔

(ج) اگر زوجین میں سے کوئی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے اگرچہ دوسرے فریق کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہیں اور کسی متعدی مرض کا معاملہ نہ ہو؛ لیکن نکاح کے بنیادی مقاصد —— جیسے: صنفی ضرورت کی تکمیل اور اولاد کا حصول وغیرہ —— میں رکاوٹ بنتی ہو، تو دوسرے فریق کے مطالبہ کے وقت بیماری کا اظہار کر دینا جائز ہے۔

(د) نکاح سے پہلے اگر خاطب یا مخطوبہ کے بارے میں کسی ایسے مرض میں مبتلا ہونے کا قرینہ موجود ہو، جس سے دوسرے فریق کو ضرر پہنچ سکتا ہو یا ان کے حقوق متاثر ہو سکتے ہوں تب تو میڈیکل ٹیسٹ کا مطالبہ کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر یہ صورت نہیں تو صرف شبہہ کی بنیاد پر اس کا مطالبہ جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ ایسے تجسس میں داخل ہے جس کو قرآن مجید میں منع کیا گیا ہے۔ (الحجرات: ۱۲)

○ ○ ○

بونڈز کا اسلامی متبادل ـــ صکوک

مولانا ظفر عابدین ندوی ●

موجودہ دور میں اہل علم اور اقتصادیات کے ماہرین نے بونڈز کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے ''صکوک'' کو بونڈز کے شرعی متبادل کے طور پر پیش کیا ہے، صکوک جمع ہے عربی لفظ صک کی، جس کے لفظی معنی ''ورق'' کے ہیں، اسلامی معاشیات کی اصطلاح میں صکوک ایسے سرٹیفکیٹ کو کہتے ہیں، جس کی خریداری کی وجہ سے کسی متعین اثاثہ یا حق میں ملکیت کا استحقاق پیدا ہو جائے، صکوک کی قیمت یکساں ہوتی ہے، اس کی خرید وفروخت ممکن ہوتی ہے اور اس میں تجزی ناممکن ہے، مالی کاغذات اصل میں کسی اثاثہ، منافع، اور حقوق کے مشترک ملکیت کے نمائندہ ہوتے ہیں، ''صک'' کا ماخذ ''تصکیک'' ہے، جس کا مطلب ماہر اقتصادیات کے یہاں وہ مالیاتی حقوق ہیں، جو کسی معاہدے کے طے ہونے کے نتیجہ میں کسی ایک پارٹی کے ذمہ لازم ہوتے ہیں، جس کو علم معاشیات کی اصطلاح میں سیکورٹائزیشن (Securitization) کہتے ہیں، خلاصہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صکوک ایک طرح کا مالی دستاویز ہے، جو مالی یا غیر مالی اثاثے میں مشترک ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کی قیمت اجراء کے وقت یکساں (برابر) ہوتی ہے۔

صکوک کی اصل

موجودہ ایجاد سے پہلے اسلامی تاریخ میں بھی صکوک کی مثالیں ملتی ہیں؛ چنانچہ امام مالک ؒ کی مؤطا میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ لوگوں میں مروان بن الحکم کے زمانہ میں صکوک کی خرید وفروخت عام ہوگئی تھی، اس زمانہ میں فوجیوں کو حکومت کی طرف سے اناج اور غلہ کے ٹوکن دیئے جاتے تھے، پھر ایسا ہوا کہ فوجیوں نے ایسے صکوک کی میوچوریٹی (Maturity) سے قبل خرید وفروخت شروع کردی اور ظاہر ہے کہ اناج اور غلے ربوی سامان میں سے ہیں؛ اس لیے اس کی اپنی ہی جنس سے بیع کے درست کے لیے ضروری ہے کہ مبیع اور ثمن کا تبادلہ ایک ہی مجلس میں ہو؛ ورنہ سود کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے؛ چنانچہ جب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور ایک صحابیؓ رسول نے حکمران وقت مروان کو اس طرف توجہ دلائی تو مروان نے تمام صکوک مارکٹ سے لے لئے اور اس کے اصل مالک کو لوٹا دیا:

وحدثني عن مالك، أنه بلغه: أن صكوكا خرجت للناس في زمان

● ریسرچ اسکالر شعبۂ اسلامی معاشیات بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، کوالالمپور (ملیشیاء)۔

مروان بن الحکم من طعام الجار فتبایع الناس تلک الصکوک بینھم ، قبل أن یستوفوھا ، فدخل زید بن ثابت ورجل من أصحاب رسول اللہ ، أتحل بیع الربا یا مروان ؟ فقال : أعوذ باللہ ، وماذاک ؟ فقالا ھذہ الصکوک تبایعھا الناس ، ثم باعوھا قبل أن یستوفوھا ، فبعث مروان الحرس یتبعونھا ، ینزعونھا من أیدی الناس ، ویردونھا إلی أصلھا ۔ (۱)

امام مالکؒ راوی ہیں،انھیں یہ بات پہنچی ہے کہ مروان بن حکم کے زمانہ میں لوگوں کے لئے ''جار'' نامی جگہ کی غذائی پیداوار کے صکوک جاری کئے گئے ،لوگ ان کی غلہ حاصل کرنے سے پہلے ہی خرید وفروخت کرنے لگے؛ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ اور ایک اور صحابیِ رسول داخل ہوئے اور دریافت کیا: مروان! کیا سود پر مبنی خرید وفروخت حلال کردی جائے گی؟ مروان نے کہا: میں اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں ، اس کا کیا معاملہ ہے؟ ان دونوں نے کہا: لوگوں نے ان صکوک کی خرید وفروخت شروع کردی ہے، وہ اسے سامان پر قبضہ کئے بغیر فروخت کردیتے ہیں،مروان نے چوکیدار کو بھیجا، وہ لوگ تلاش کرکے ان کو لوگوں کے ہاتھ سے لے کر اصل مالک کو لوٹانے لگے۔

اسی طرح خلافتِ عثمانیہ کے دور میں جب عثمانی امپائر کورُوس سے شکست ہوئی اور جنگی اخراجات کی وجہ سے حکومتی خزانہ دیوالیہ کا شکار ہوگیا،تو حکومت وقت نے اخراجات کی پابجائی کے لئے مالی ستاویز جاری کئے،اگر چہ اس دستاویز کا نام ''اسا ہم'' رکھا گیا تھا؛لیکن اس کا اسٹرکچر صکوک کے مماثل تھا؛ کیوں کہ اس سند کے جاری کرنے کا مقصد بھی فنڈس حاصل کرنا تھا اور خریدار کو اس کے ذریعہ سے نفع ملتا تھا۔

صکوک کی قسمیں

بناوٹ اور خصوصیات کے اعتبار سے صکوک کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(۱) کارپوریٹ صکوک(Corporate Sukuk)،یعنی ایسے صکوک جس کو کسی کارپوریشن یا کمپنی نے متعارف کرایا ہو۔

(۲) حکومتی صکوک(Sovereign Sukuk)،یعنی: ایسے صکوک جس کو کسی ملک کی حکومت یا حکومت کے تحت چلنے والے ادارہ جیسے سنٹرل بینک نے جاری کیا ہو۔

---

(۱) مؤطا امام مالک ، کتاب البیوع،حدیث نمبر:۱۳۱۴۔

(۳) قابل تبدیل صکوک (Exchangeable and Conyertible Sukuk) ، یعنی : ایسے صکوک جوایک مدت کے بعد بونڈ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

(۴) اثاثے پرمبنی صکوک (Assets Backed) ، یعنی: وہ صکوک جوکسی نفع بخش حقیقی اثاثے پرمبنی ہو اوراس قسم کے صکوک کی ایک اور خاصیت یہ ہوتی ہے کہ صکوک کے حاملین خسارہ کی صورت میں اصل اثاثے پراپنا دعویٰ کرسکتے ہیں؛اس لیےاس میں خطرہ کم ہوتا ہے۔

صکوک اور بونڈز میں فرق

صکوک اورمروجہ باؤنڈز میں کم سے کم تین جہتوں سے بنیادی فرق پایا جاتا ہے :

(الف) صکوک میں نفع کی ضمانت نہیں ہوتی ،صکوک حاصل کرنے والانقصان سے بھی دوچار ہوسکتا ہے؛ جب کہ باؤنڈز میں نفع کی ضمانت ہوتی ہےاور باؤنڈز جاری کرنے والامقررہ وقت میں متعینہ نفع دینے کا پابند ہوتا ہے۔

(ب) صکوک مرابحہ،مضاربت،مشارکت،اجارہ اوروکالت وغیرہ پرمبنی ہوتا ہے، باؤنڈز کی بنیاد قرض پرہوتی ہےاوراس میں قرض پرنفع حاصل کیا جاتا ہے۔

(ج) صکوک اس پروجیکٹ کے متناسب حصہ کی نمائندگی کرتا ہے، جس کا سرمایہ ان صکوک کے پیچھے ہے، جیسے: مشارکہ کا رأس المال،مضاربہ کا رأس المال،مرابحہ کی مبیع وغیرہ، جب کہ'باؤنڈز' قرضوں میں باؤنڈ کے خریدار کے حصہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

صکوک کے اقتصادی فوائد

صکوک سے مختلف اقتصادی فوائد متعلق ہیں :

(الف) سرمایہ کاری کے طریقے میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔

(ب) چھوٹی چھوٹی رقموں کی بھی سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے۔

(ج) کسی بھی وقت کاروبار سے باہر نکلا جاسکتا ہے۔

(د) ترقیاتی پروجکٹ میں اضافہ ہوتا ہے۔

صکوک کے اجراء کے لئے شرعی ضرورتوں کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ کس اسلامی کنٹراکٹ پر صکوک کی بناوٹ یا اس کا (Structure) ہوتا ہے،مثال کے طور پر اگر مضاربت کو استعمال کیا گیا ہے تو اس معاملہ کے تقاضے جو ہوں گے،اس کو پورا کرنا ہوگا،اسی طرح جو صکوک اجارہ پرمبنی ہوں گے،اس پر اجارہ کے شرعی احکام مرتب ہوں گے،تاہم تین اُمور ایسے ہیں جن کا لحاظ کرنا ہر صورت میں ضروری ہوگا :

(۱) اسلامی صکوک کے لئے ضروری ہے کہ ہر حال میں اس کی بناوٹ قرض کے معاملہ پر مبنی نہ ہو؛ کیوں کہ اگر عاقدین کے درمیان معاملہ قرض کا ہے تو اس پر کسی بھی طرح کا نفع حاصل نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ پھر وہ نفع سود سمجھا جائے گا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ صکوک کے اصل اثاثوں میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا کہ صکوک کے بنیادی اثاثے (Under Assets) اسلامی شریعت کے مغائر مقصد میں استعمال نہ ہوں، مثال کے طور پر ایسی عمارت جس کے بیشتر حصہ پر سودی بینک قائم ہو، یا اس عمارت کا اکثر حصہ غیر شرعی کام کے استعمال میں ہو۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ بنیادی اثاثے کا اکثر حصہ مالی واجبات، قرض اور سیال اثاثہ (Liquid Assets) پر مشتمل نہ ہو، ورنہ ایسے صکوک کی سکنڈری مارکٹ میں خرید وفروخت بعض صورتوں میں جائز نہیں ہوگی؛ کیوں کہ بونڈز اور شیئرز کی قیمت طلب اور اس کی کثرت وقلت کے تابع ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے، جب کہ کیش وغیرہ کا تبادلہ ثمن سے ہو تو برابری ہونا ضروری ہے۔

مالی واجبات سے مراد ایسی مالی ذمہ داری ہے، جو کسی ایک فریق پر معاملہ کے انعقاد سے پیدا ہوتی ہے، جیسے: مرابحہ فائنانسنگ کی وجہ سے کسٹمر کو متعین رقم متعین سالوں میں بینک کو ادا کرنی پڑتی ہے؛ چنانچہ مالی حقوق کو صکوک کے مکونات میں شامل کرنا درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے صکوک کی خرید وفروخت سکنڈری مارکٹ میں ممکن نہیں ہو پائے گی، جب کہ بونڈز یا صکوک میں انویسٹ کرنے کا اہم فائدہ ضرورت پڑنے پر بہ سہولت نقد (Liquidity) کا حصول بھی ہوتا ہے، جو مذکورہ صورت میں قابل عمل نہیں ہو پائے گا — تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملیشیاء میں ایسے صکوک قابل فروخت مانے گئے ہیں؛ کیوں کہ ان کے یہاں 'بیع الدین' بغیر کسی شرط کے جائز ہے؛ جب کہ مشرقِ وسطیٰ اور دنیا کے دیگر حصوں کے اسکالرس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بیع الدین کی اجازت نہیں ہے۔

(۴) چوتھی اہم شرعی ضرورت مکمل شریعہ گورننس (الرقابة الشرعية) کی ہوگی، اس ضرورت کی تکمیل 'شریعہ بورڈ' کے قیام سے پوری ہوسکتی ہے، شریعہ بورڈ کا کام صرف فتویٰ دینا اور رہنمائی کرنے تک ہی محدود نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ صکوک کے پیچھے موجود اثاثہ، دستاویزات کی تیاری اور پھر اس کی تدقیق (Shariah Auditing) وغیرہ کی پوری کاروائی کی ناقدانہ اور راست نگرانی اس بورڈ کی ذمہ داری ہوتی ہے؛ تاکہ ہر پروڈکٹ کی شرعی تعلیمات سے ہم آہنگی یقینی ہو پائے۔

○ ○ ○

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات
قرآن وحدیث کی ہدایات اور امام اوزاعیؒ وامام محمد شیبانیؒ کے اجتہادات کی روشنی میں

خالد سیف اللہ رحمانی

اسلامی قانون کا ایک حصہ ''سیر'' کہلاتا ہے، جس میں بین قومی تعلقات اور صلح وجنگ سے متعلق اُمور پر بحث کی جاتی ہے، قانون سیر کو سب سے پہلے نہایت تفصیل کے ساتھ امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے پیش کیا، مستشرقین کو بھی اعتراف ہے کہ اس شعبۂ قانون کو سبقت اور تقدم حاصل ہے، امام محمدؒ کے علاوہ جن فقہاء کو اس باب میں امتیاز حاصل ہے ان میں ایک فقیہ شام امام اوزاعیؒ بھی ہیں، سال در سال پہلے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی تجویز پر جامعۃ الامام اوزاعی (اُردن) نے اکیڈمی کے اشتراک سے ایک سیمینار کرنا طے کیا تھا، اس کے لئے سیمینار کے داعیوں کی خواہش پر اس حقیر نے یہ مقالہ تھا، اگر چہ کہ سیمینار نہ ہوسکا؛ لیکن یہ مقالہ قارئین کے استفادہ کے لئے موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں کے درمیان تعلقات کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور پوری دنیا میں اس موضوع کو اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، یہاں تک کہ جو قومیں نسلی تفریق پر یقین رکھتی ہیں، جیسے یہودی اور ہندو برہمن اور ان کی مددگار طاقتیں، وہ بھی مسلمانوں کو بدنام کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور خود انسانی حقوق کی علم بردار بنی ہوئی ہیں، اس پس منظر میں ضرورت ہے کہ بین قومی تعلقات اور مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والوں کے احترام نیز دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات اور فقہاء اسلام کے نظریات کو وضاحت وتفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔

پوری انسانیت — ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی :

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، نیز ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے ، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اُخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان انسانی رشتہ سے ہمارا بھائی اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اُخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا پیغام دیتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمارے دل میں ہر فرد بشر سے محبت ہونی چاہئے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت وکرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیت انسان اللہ تعالیٰ نے قابل احترام قرار دیا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْ آدَمَ ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوعِ انسان سے متعلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جان تو اس میں بھی ہے (۱)، غزوۂ احزاب ک

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲، باب من قام بجنازة یهودی۔

موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر لاش ان کے حوالہ کردیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر لاش واپس کردی (۱)؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آ ہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔ (۲)

کافر کہنا تحقیر نہیں

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی روا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لئے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کرکے ان کی تحقیر کی گئی ہے، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، کافر دراصل غیر مسلم کا ہم معنی ہے ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَهُمْ بِالْاٰخِرَ ةِ هُمْ كَافِرُوْنَ '' (یوسف:۳۷) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جس کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے، اس لئے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ '' (الزخرف:۲۴) یعنی ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛ چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل کیا گیا ہے :

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَاِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ ۔ (الزخرف:۳۰)

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم (Non Muslim) کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین۔

اگر کافر کا لفظ اہانت آمیز ہوتا تو اس پر سب سے زیادہ اعتراض اہل مکہ کو ہوتا؛ کیوں کہ قرآن مجید میں بار بار ان کو ''کافرون'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے اور ایک مختصر سورت بھی اسی نام سے موسوم ہے؛ لیکن سیرت کی کتابوں میں کہیں یہ بات نہیں آتی کہ انھوں نے اس لفظ کا برا مانا ہو۔

پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو تو اس کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر خطاب کرے گا تو گنہگار ہوگا :

لو قال لذمی : یا کافر ، یأثم إن شق علیه ۔ (۳)

---

(۱) البدایة والنهایة:۴/۱۰۷۔ (۲) ترمذی:۲/۴۰۱۔ (۳) الأشباه والنظائر:۲/۲۵۷۔

ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمہ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے :

رجل ذمی ، معناہ له عهد ۔ (۱)

مرد ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین و أمانتهم ۔ (۲)

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ میں غیر مسلم کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

غیر مسلموں کے مختلف گروہ اور ان کا حکم

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی بات ہے تو اس سلسلے میں بنیادی طور پر دو پہلو پیش نظر رہنا چاہئے: اول یہ کہ اسلام کی نسبت سے تمام غیر مسلموں کا رویہ یکساں نہیں رہتا ہے؛ بلکہ مختلف گروہوں کا سلوک الگ الگ ہوسکتا ہے، اس اعتبار سے ان کی تین قسمیں فقہاء کے یہاں ملتی ہیں اور امام محمد شیبانی نے اپنی کتابوں میں اس کو وضاحت سے لکھا ہے :

(۱) اہل ذمہ: یہ مسلم حکومت میں بسنے والے غیر مسلم ہیں، خواہ وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں ہوں۔

(۲) موادعین: وہ غیر مسلم ممالک اور ان کے باشندے جن سے مسلمانوں کی صلح ہو، اگر کسی ملک سے باضابطہ صلح نہ ہو؛ لیکن وہاں کا کوئی باشندہ تجارت یا کسی اور غرض سے خصوصی اجازت (امان) لے کر مسلمان ملک میں آجائے یا مسلمان ملک کا کوئی شہری — خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر ذمی — خصوصی اجازت لے کر دارالحرب میں تجارت وغیرہ کے لئے جائے، تو ایسے شخص کو ''مستامن'' کہتے ہیں؛ اگرچہ مسلمان اور اس غیر مسلم حکومت کے

---

(۱) لسان العرب:۵/۵۹۔

(۲) النہایة:۲/۱۶۸۔

درمیان حکومتی سطح پر کوئی معاہدہ نہیں ہوتا؛ لیکن امان لے کر داخل ہونے والے مسلمان کی دارالحرب کے شہریوں سے اور اسی طرح امان لے کر داخل ہونے والے کافر کی مسلم مملکت کے مسلمان شہریوں سے صلح سمجھی جائے گی اور جو احکام دو ایسی قوموں سے متعلق ہیں، جن میں آپس میں صلح ہوئی ہو، وہی ان پر بھی نافذ ہوں گے۔

(۳) محاربین: یعنی دارالحرب میں بسنے والے لوگ، جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں اور جن کا مسلمان مملکت سے کوئی معاہدۂ امن نہ ہو۔

غیر مسلموں کی ان تینوں قسموں کا ذکر امام اوزاعی اور امام محمد کے بشمول اجمال یا تفصیل کے ساتھ تمام ہی فقہاء کے یہاں موجود ہے، دارالحرب کی تعریف کے سلسلے میں گو فقہاء کے یہاں کسی قدر تعبیر کا اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن خلاصہ یہی ہے کہ جہاں مسلمان اپنے آپ کو مامون نہ پاتے ہوں اور انھیں اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی حاصل نہ ہو، وہ دارالحرب ہے؛ چنانچہ علامہ علاء الدین کاسانیؒ نے دارالاسلام اور دارالحرب کی تفصیلی بحث کا حاصل ان الفاظ میں لکھا ہے :

ومعناه ان الامان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق ، فهي دارالاسلام ، وان كان دارالامان فيها للكفرة على الاطلاق ، فهي دارالكفرة ۔ (۱)

گویا جس ملک میں مسلمان مامون ہوں، وہ دارالحرب نہیں، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر کسی خطہ میں اسلامی احکام پر بھی عمل کئے جائیں اور وہاں احکام کفر بھی جاری ہوں، تب بھی اس کا شمار دارالحرب میں نہیں ہوگا؛ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں :

لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرك ، لاتكون دارالحرب۔ (۲)

اور اسلامی احکام کے جاری ہونے سے مراد تمام احکام کا اجراء نہیں ہے؛ بلکہ بقول علامہ علاء الدین حصکفیؒ کے، اگر وہاں جمعہ وعیدین وغیرہ پڑھی جاتی ہے تو یہ بھی اجراء احکام اسلام میں داخل ہے :

و دارالحرب تصير دارالاسلام باجراء احكام اهل الاسلام فيها كجمعة وعيد ۔ (۳)

دارالحرب کے باشندے محاربین کہلاتے ہیں، موجودہ دور میں غیر مسلم ممالک کی غالب اکثریت وہ ہے، جہاں جمہوری نظام اختیار کیا گیا ہے، اس نظام کے تحت ملک کے تمام شہریوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عقیدہ

---
(۱) بدائع الصنائع:۱۳۱/۷۔ (۲) ردالمحتار:۲۵۳/۳۔ (۳) الدرالمختار مع الرد:۲۵۳/۳۔

رکھنے، مذہب پر عمل کرنے اور مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج کی دنیا میں بہت کم ممالک ایسے ہیں، جن کو دارالحرب کہا جا سکے، اسی طرح اقوام متحدہ کے ممبر ممالک اُصولی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گے، یہ اور بات ہے کہ بعض سرکش ممالک بعض اوقات اپنے اس عہد کی خلاف ورزی بھی کر گذرتے ہیں، بہر حال داخلی نظام میں جمہوریت اور خارجہ پالیسی میں دوسرے ممالک کے اقتدار کے احترام کرنے کا عہد یہ دو ایسی باتیں ہیں، جن کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ آج کی دنیا میں بہت کم ممالک ایسے ہیں، جن کو دارالحرب کہا جا سکے۔

اس پس منظر میں مسلم غیر مسلم تعلقات سے متعلق جو احکام ان سطور میں کتاب وسنت اور فقہاء بالخصوص امام اوزاعیؒ اور امام محمدؒ کے حوالہ سے ذکر کئے جائیں گے، وہ مسلم ممالک میں بسنے والے غیر مسلم اور ایسے غیر مسلم ممالک سے متعلق ہوں گے، جہاں مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ پُر امن طریقہ پر رہنے کی اجازت ہے، دارالحرب اور حربیوں سے متعلق احکام قوانین جنگ، استیمان یعنی امان حاصل کر کے آنے والے لوگوں اور قیدیوں اور سفیروں سے متعلق ملتے ہیں، جن کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفاء کیا جائے گا۔

تعلقات کی مختلف جہتیں

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بھی مختلف نوعتیں ہیں اور بہ حیثیتِ مجموعی ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(الف) سماجی تعلقات۔
(ب) معاشی تعلقات۔
(ج) سیاسی تعلقات۔
(د) فوجی تعلقات۔
(ہ) مذہبی تعلقات۔

تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث اور فقہاء کے اجتہادات سے ہمیں روشنی ملتی ہے۔

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنة:۸)

جولوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کوتمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کوان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیرمسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہےاوراس سے یہ بات واضح ہے کہ جوغیرمسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں،مسلمانوں پران کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے،قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پرآنا اوردین حق کوقبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنااورحسن سلوک سے رُک جانا درست نہیں،مسلمان ان کے ساتھ جوبہتر سلوک کریں گے،انھیں بہرحال اس کا اجرمل کررہے گا :

لَيْسَ عَلَيْکَ هُدَاهُمْ وَلٰکِنَّ اللهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْکُمْ ، وَاَنْتُمْ لاَ تُظْلَمُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے،اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اورتم جوکچھ خرچ کرتے ہووہ اپنے ہی لئے کرتے ہواورخرچ نہیں کرتے ہومگراللہ کی خوشنودی کی تلاش میں اور جوبھی خرچ کروگےتم کو پوراپورا دے دیا جائے گا (یعنی اس کا اجر ملے گا)اورتم پرظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنوقریظہ اور بنونضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی،انصاران پراس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گےتو اسلام قبول کریں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیااورفرمایا:’’ان کی ہدایت کاتعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛لیکن تم اس کی وجہ سے اپنا دست تعاون نہ کھینچو؛ کیوں کہ تم کوتمہارے انفاق کا اجرمل کررہے گا۔(۱)

رسول اللہ ﷺاورآپ کے رفقاء نے عملی طور پراس کو برت کردکھایا،مکہ میں شدید قحط پڑا،لوگ مرداروغیرہ کھانے پرمجبور ہوگئے، یہ زمانہ مسلمانوں اورمشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اورگرماگرمی کا تھا،اس کے باوجودآپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجا،حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان

---

(۱) الجامع لأحکام القرآن:۳/۳۳۷۔

سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کررہے تھے۔(۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے ''**ما أنصفناک أکلنا شیبتک ، ثم نأخذ منک الجزیة**''(۲) چنانچہ فقہاء کے ہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقات نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک بشمول امام محمدؒ راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں (۳)؛ البتہ امام اوزاعیؒ کے نزدیک صدقاتِ نافلہ تو غیر مسلم کو دیئے جاسکتے ہیں، زکوٰۃ اور صدقات واجبہ نہیں دیئے جاسکتے۔(۴)

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعت اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اُصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں :

دمائهم کدمائنا ، وأموالهم کأموالنا ۔(۵)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے :

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (بنی اسرائیل:۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ۔ (المائدۃ:۳۲)

---

(۱) ردالمحتار:۳۰۲/۳، باب الصرف۔ (۲) نصب الرایة:۴۵۴/۳۔

(۳) دیکھئے: الدرالمختار علی ھامش رد:۳۰۱/۳۔

(۴) دیکھئے: موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ ، زکوٰۃ ۶/، زکوٰۃ الفطر ۵/، کفارۃ ۵/أ۔

(۵) نصب الرایة:۳۶۹/۴۔

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو
گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل وغارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے، اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس غیر مسلم ـــ جس سے امن اور بقاء باہم کا معاہدہ ہو ـــ کے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا :

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة ، وإن ريحها يوجد من مسيرة أربعين يوما ۔(۱)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پرامن زندگی گذارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر دے تو مسلمان کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا، کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اُصول بتایا ہے کہ جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ'' (المائدۃ:۴۵) اس میں مسلمان غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا(۲)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا(۳)، امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔(۴)

یہ حنفیہ کا نقطۂ نظر ہے اور یہی رائے امام محمد بن حسن شیبانیؒ سے صراحتاً منقول ہے، چنانچہ فرماتے ہیں'' **لان المسلم يقتل بالذمي عندنا**''(۵)؛ امام اوزاعیؒ کے نزدیک کافر کے بدلہ مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا۔(۶)

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۳۱۶۶، عن عبد الله بن عمروؓ۔

(۲) مصنف عبد الرزاق:۱۰/۱۰۱۔

(۳) مصنف عبد الرزاق:۱۰/۱۰۱۔

(۴) مسند امام شافعی ، سنن البیهقی:۱۲/۴۳۔

(۵) شرح السير الكبير:۴/۵۲۔

(۶) دیکھئے: موسوعة فقه الإمام الأوزاعي: جنايه:۳۔

اگر مقتول کے ورثہ سزائے قتل کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو، تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی (۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ اور مختلف صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔(۲)

جس غیر مسلم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، اس کی جان کی اہمیت اور اس کے تحفظ کا اس درجہ اہتمام کیا گیا کہ اگر کوئی حربی بھی امان لے کر مسلمانوں کے ملک میں آئے اور وہی غیر مسلم ملک یا کوئی مسلم ملک کسی مسلمان قیدی کے فدیہ کے طور پر اس غیر مسلم کی حوالگی کا مطالبہ کرے اور اس غیر مسلم حربی کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ حوالہ کیا گیا، تو اسے قتل کردیا جائے گا تو ایسی صورت میں ایک مسلمان قیدی کو بچانے کے لئے اس مستامن حربی کی جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز نہیں؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

> **فان دخل حربی منهم الینا بامان ، فطلبوا مفاداة الاسیر بذلک المستامن و کره ذلک المستامن وقال ان دفعتمونی الیهم ، قتلونی ، فلیس ینبغی لنا ان ندفعه الیهم ، لانه فی أمان منا ، فیکون کالذمی ، اذا کره المفادة به ، ولانا نظلمه فی التعریض بقتله بالرد علیهم ، والظلم حرام علی المستامن والذمی والمسلم .** (۳)

یہاں تک کہ اگر اس پناہ لینے والے شخص کی وجہ سے اس ملک کے حملہ کرنے کا اندیشہ ہو، تب بھی مسلمانوں کے لئے اسے حوالہ کرنا مناسب نہیں :

> **وان قال المشرکون للمسلمین ، ادفعوه الینا و إلا قاتلناکم ، ولیس بالمؤمنین علیهم قوة ، فلیس ینبغی للمسلمین ان یفعلوا ذلک ؛ لانه غدر منا .** (۴)

امام اوزاعیؒ کے یہاں اگرچہ حربی مستامن کے حقوق کے سلسلے میں بہت زیادہ وضاحت نہیں ملتی؛ لیکن ان کے نزدیک بھی مستامن پر زیادتی قابل سرزنش جرم ہے :

---

(۱) سنن دار قطنی:۱۴۷/۸،کتاب الدیات ، بات دیة اهل الذمة۔
(۲) دیکھئے:نصب الرایة:۳۶۹/۴-۳۶۸۔
(۳) شرح السیر الکبیر:۳۰۰/۳۔
(۴) شرح السیر الکبیر:۳۰۰/۳۔

قال الاوزاعیؒ فی رجل من العدو إستامن إلی المسلمین ، فلقیه رجل من المسلمین ، فقتله بعد أمانه عمدا أو خطأ ، قال : إن قتله خطاء ، فعلی عاقلته ، ثم یوقف عقله ، فان جاء ولی یثبت ، دفع الیه عقله ، وان کان عمداً عاقبه الامام ، وجعل عقله فی ماله خاصة ، فان جاء ولی له دفعه الیه۔ (۱)

مواد عین یعنی وہ قوم جس سے مسلمانوں کا بقاء باہم کے اُصول پر ایک دوسرے کے ساتھ پر امن طریقہ پر رہنے کا عہد ہو، اگر اس کے بعض افراد مسلمانوں کے دشمن ملک میں کسی غرض سے گئے ہوں اور مسلم فوج کے حملہ کے درمیان وہ پکڑے جائیں اور یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ مواد عین میں سے ہیں، تو امام محمدؒ کے نزدیک ان سے بھی تعرض کرنا جائز نہیں :

ولو دخل رجل من موادعینا دار الذین وادعوهم بتلک الموادعة ، فقاتلنا اهل تلک الدار ، فظهرنا علیهم ، فقال الرجل : انا من اهل دار موادعیکم دخلت الی هٰؤلاء لموادعة بیننا وبینهم ، لم یقبل قوله الا بحجة ۔(۲)

اور یہی حکم مسلمان ملک میں بسنے والے غیر مسلم یعنی ذمیوں کے لئے بھی ہے :

ولو قال : کنت ذمیا ، دخلت إلی هذه الدار للتجارة فأقام البینة من المسلمین لم یحل اسره وقتله ۔(۳)

دارالحرب (دشمن ملک اور اس کے وہ شہری، جنھوں نے امان حاصل نہیں کیا ہو) پر اگر چہ حملہ کرنا جائز ہے؛ لیکن ایسے ملک کے بھی سفیر پر حملہ کرنا جائز نہیں؛ چنانچہ امام محمدؒ کی معروف کتاب المبسوط میں ہے :

قلت : أرأیت الرجل من أهل الحرب یوجد فی دار الاسلام فیقول : أنا رسول ، ویخرج کتاب الملک معه ؟ قال : إذا عرف أنه کتاب الملک ، کان آمنا ، حتی یبلغ رسالته ویرجع ، وان لم یعرف أنه کتاب الملک فهو فيء وجمیع ما معه ۔ (۴)

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۸/۱۷۸،معزیا الی مختصر اختلاف العلماء:۲۹۲/۱۱۔

(۲) شرح السیر الکبیر:۹/۲۔

(۳) شرح السیر الکبیر:۹/۲۔

(۴) کتاب السیر والخراج والعشر:۱۶۳۔

یہی بات امام محمد نے مزید وضاحت کے ساتھ ''سیر صغیر'' میں بھی لکھی ہے :

واذا وجد الحربي في دارالاسلام ، فقال : أنا رسول وأخرج كتاب الملك معه ، فإذا عرف أنه كتابه ، كان آمنا ، حتى يبلغ رسالته ويرجع ۔ (۱)

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اُصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضا مندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جا سکتا ہے، نہ کسی غیر مسلم کا ''اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ'' ۔(النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کر دیئے اور کچھ پھل کھا لئے ، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر مختصر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے ۔(۲)

متعدد صحابہ کرامؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے :

ألا ! من ظلم معاهداً أو انتقصه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طيب نفس ، فأنا حجيجه يوم القيامة ۔ (۳)

آگاہ ہو جاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی، یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف کیا، یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے(۴)، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

---

(۱) كتاب السير الصغير:۳۴۔

(۲) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۳۰۵۰۔ (۳) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۳۰۵۳۔

(۴) المغنی لابن قدامة:۱۲/۴۵۱، مع تحقيق : عبد الله بن عبد المحسن وغیرہ۔

امام محمدؒ نے معاہدین کے املاک کے بارے میں اُصولی بات لکھی ہے کہ :

وإذا وادع المسلمون قوما من المشركين فليس يحل لهم أن ياخذوا شيئاً من أموالهم إلا بطيب أنفسهم للعهد الذى جرى بيننا وبينهم فإن ذلک العهد في حرمة التعرض للأموال والنفوس بمنزلة الإسلام فكما لايحل شيء من أموال المسلمين إلا بطيب أنفسهم فكذلک لا يحل شيء من أموال المعاهدين ۔ (۱)

یہاں تک کہ اگر جنگ کی صورت حال نہ ہو اور کوئی مسلمان امان لے کر دارالکفر میں گیا ہو تو اس کے لئے بھی کسی غیر مسلم کا مال بلا اجازت لینا جائز نہیں؛ چنانچہ امام اوزاعیؒ سے منقول ہے :

إذا دخل المسلم دارالكفر بأمان ، فليس له أن ياخذ من أموالهم شيئا إلا باذنهم ولا ياكل منهم الربا ؛ لان المومن ليس بختار ولاغدار ۔ (۲)

حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمان مستامن کے لئے حربی سے اگر چہ درہم و دینار کے باہمی تبادلے میں زیادہ رقم لینی جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ان کے نزدیک سود نہیں؛ اس لئے کہ سود تو مالِ معصوم کا لینا ہے اور حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا ہے، تاہم حنفیہ کے یہاں بھی حربی کی رضامندی کے بغیر اس کا مال لینا جائز نہیں؛ چنانچہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں :

فباى وجه أخذ أموالهم برضا منهم ، فهو جائز ۔ (۳)

یہی نقطۂ نظر امام اوزاعیؒ کا بھی ہے اور ان کے نزدیک تو غیر مسلم سے ربا لینا بھی حرام ہے (۴) —— بلکہ حربی مستامن کا انتقال مسلمان ملک میں ہوگیا، تب بھی امام اوزاعیؒ نے صراحت کی ہے کہ اس کا مال دارالحرب میں اس کے ورثہ کو بھیج دیا جائے گا :

إذا مات المستامن في دارالاسلام وترک مالاً ، وورثته في دارالحرب : إن كانوا اولىٰ بميراثه من المسلمين أعطي ورثته ميراثه بكتاب ملكهم أنهم ورثته وشهادة بعضهم لبعض ۔ (۵)

---

(۱) شرح السير الكبير:۱/۹۲۔

(۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ :۹/۱۷۔

(۳) الرد على سير الاوزاعی:۹۲۔ (۴) حوالۂ سابق۔

(۵) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۸۷،معزيا إلى الأوسط:۱۱/۲۷۳۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلاتفریق مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے(۱) مومنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يٰاَ يُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِجْتَنِبُوْا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِّ ، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ، وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۔ (الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اُڑائے ،ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں ، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں ، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا(النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ،معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے،عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی جو چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں ، یا غیر مسلموں کے ساتھ ، مطلقاً حرام ہیں ، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبرو ریزی کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت وآبرو کی حفاظت کا وہی حق غیر مسلم باشندوں کو حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

البتہ دار الحرب سے جنگ کے درمیان جو عورتیں گرفتار ہوں ، وہ باندی ہیں اور مسلم حکومت انھیں تقسیم کردے، تو جو عورت جسے دی جائے ، اس کے لئے اس سے انتفاع جائز ہے؛ لیکن یہ ایک قانونی عمل ہے، ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھی مسلمان کسی غیر مسلم عورت کو پکڑ لے، تو وہ اس کے لئے مباح ہو جائے ، یہاں تک کہ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

أما لو وطئ جارية من المغنم قبل أن تصير إليه فإنه يجلد مائة جلده ، وتقوم قيمة عدل ويلحق ولدها به ۔(۲)

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا ، کھلانا ، پڑھنا ، پڑھانا ، باہمی ملاقات ،خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ

---

(۱) ترمذی،حدیث نمبر:۱۹۱۹،باب ماجاء في رحمة الصبيان۔ (۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ:۲۹۳۔

اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (۱) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (۲) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز وتکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (۴) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے۔ (۵)

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان کا مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

أخلفک الله خيرا منه ، وأصلحک ۔ (۶)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

یہ احکام فقہاء احناف کی طرف منسوب ہیں، جن میں ظاہر ہے کہ امام محمد بھی شامل ہیں، امام اوزاعی کے یہاں اس کی صراحت نہیں مل پائی؛ لیکن بظاہر ان کا نقطۂ نظر بھی یہی ہوگا؛ کیوں کہ بہت سے فقہاء نے غیر مسلم کو سلام کرنے سے منع کیا ہے؛ لیکن امام اوزاعیؒ کا رجحان اس کے جواز کی طرف ہے :

سئل الأوزاعي عن مسلم مر بكافر ، فسلم عليه ؟ فقال : إن سلمت فقد سلم الصالحون قبلک ، يريد : ابن مسعود وأبا أمامة ، وإن تركت ، فقد ترک الصالحون ۔ (۷)

تعلیم وتعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم وتعلم بھی درست ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا علم وحکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۱۷، باب قبول الهدية من المشركين۔ (۲) الدر المنثور: ۱۸۱/۵۔
(۳) الخصائص الكبرىٰ: ۱۲۳/۸۔ (۴) إعلاء السنن: ۲۸۲/۸، باب مايفعل المسلم إذا مات له ……۔
(۵) بخاری، حدیث نمبر: ۵۶۵۷، باب عيادة المشرک۔
(۶) الفتاوىٰ الهندية: ۳۸۴/۵۔ (۷) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ: ۴۵۴۔

''الکلمة الحکمة ضالة المؤمن ''(۱) چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے سے واقف تھے آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں (۲) اسی لئے تعلیم و تعلم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم و رواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھو نہیں دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

لیس منا من تشبه بغیرنا ۔ (۳)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لئے آپ ﷺ نے سلام کے طریقہ، ڈاڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھو دیں، یہ دونوں باتیں فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کے طریقہ پر تجارت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دی اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کر لیا، جس کا بخاری اور مختلف کتب احادیث میں ذکر موجود ہے (۴)، مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتب احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے (۵) حضرت خبابؓ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائلؓ کے لئے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے ''خباب کان قینا فعل للعاص بن وائل''۔(۶)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطہ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت میں دشواری ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ''دلیل'' کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے

---

(۱) ترمذي، حدیث نمبر: ۲۶۸۷، عن أبي هریرةؓ۔ (۲) البدایة والنهایة: ۳۲۸/۳۔

(۳) ترمذي، حدیث نمبر: ۲۶۹۵۔ (۴) بخاری، حدیث نمبر: ۴۲۴۸، باب معاملة النبي اعلی أهل خيبر۔

(۵) کنز العمال: ۳۲۱/۲۔ (۶) بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۷۰۶۲۔

بطور ''دلیل'' اُجرت دے کر ساتھ رکھا، (۱) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں ''**يجوز أن يكون الأجير ذميا والمستأجر مسلما بلا خلاف**''۔(۱)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم، ابن اثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامین سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضدالدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقتور حکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاصا تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔(۳)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاشی تعلقات کے سلسلے میں فقہاء کا نقطۂ نظر اس بات سے واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اجارہ، بیع، مزارعت، مساقات، مضاربت، شرکت وغیرہ میں فریقین یا ان میں سے ایک کے مسلمان ہونے کو ضروری قرار نہیں دیا ہے اور یہ بات فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے؛ بلکہ حربیوں سے بھی معاشی تعلقات کی ممانعت نہیں رکھی گئی ہے، مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ امان حاصل کر کے دارالکفر میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کریں، امام اوزاعیؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے(۴) اور امام ابو یوسفؒ نے بھی۔(۵)

بلکہ دارالحرب کے غیر مسلم باشندے کو بھی اجازت ہوگی کہ وہ مسلمان ملک میں امان لے کر تجارت کرے؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

> **وإذا دخلها مشرك تاجر على أن يتجر ويرجع إلى بلاده لم يمنع من ذلك ، وإنما يمنع من أن يطيل فيها المكث حتى يتخذ فيها مسكنا ۔** (۲)

اگر وہ دارالحرب کا باشندہ نہ ہو؛ بلکہ ایسے ملک کا باشندہ ہو، جن سے مسلمانوں کی صلح ہو، تب تو انھیں امان لے کر بھی آنے کی ضرورت نہیں، امان لئے بغیر بھی وہ ایک مسلم ملک میں آکر تجارت کرسکتے ہیں؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) أحكام أهل الذمة لابن قيم:۲۰۷۔ (۲) الموسوعة الفقهية:۱۰۵، مادہ: اجارہ۔
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالاتِ شبلی:۲/۲۱۹-۲۱۷۔ (۴) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ:۹/۱۷۔
(۵) دیکھئے: الرد على سير الأوزاعيؒ:۹۶، باب بيع الدرهم بالدرهمين في أرض الحرب بأمان۔
(۲) شرح السير الكبير:۳/۲۵۷۔

قلت : أرأيت إن دخل منهم إلى دارالاسلام تاجر بغير أمان إلا الموادعة التي كانت لهم ؟ قال : هو آمن بتلك الموادعة ۔(۱)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا؛ کیوں کہ سیاسی مدو جزر اور اُتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی ؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کردیا، چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے قبیلہ کے لوگ بھی نہیں تھے، اس لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ بزور طاقت اپنا حق حاصل کرسکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا ''**لو أدعى به في الإسلام لأجبت**''۔(۲)

بنواُمیہ کے دور میں حضرت حسینؓ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسینؓ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا(۳) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ

(۱) كتاب السير والخراج والعشر:۱۵۵،باب موادعة اهل الحرب۔

(۲) البداية والنهاية :۲/۲۹۱۔

(۳) سیرت ابن هشام:۱/۱۳۵۔

سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اُصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جا سکتا ہے اور ان سے تعاون لیا جا سکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارت خزانہ طلب فرمایا ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ ''(یوسف:۵۵)حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

فقہاء کے یہاں غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اشتراک کی تفصیل عام طور پر نہیں ملتی؛ کیوں کہ اس زمانہ میں ایسی مملکت کا تصور نہیں تھا، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ اقتدار میں شریک وسہیم ہوں؛ کیوں کہ ایک تو شاہی حکومت ہوتی تھی، جس میں اقتدار فرد واحد پر مرکوز ہوتا تھا، دوسرے عام طور پر سلطنت کا ایک مذہب متعین ہوتا تھا، دوسرے مذہب کے لوگوں کو اگر اس ملک میں پرامن طریقہ پر رہنے کی اجازت مل جاتی، تو یہی بہت بڑی بات تھی، ان کا اقتدار میں شریک ہونا ناقابل تصور تھا؛ البتہ فقہاء کے ذکر کئے ہوئے اُصولوں سے ہم اس سلسلے میں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

مبنی برانصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اُصولوں پر مبنی ہوں گے، اول: ان قوانین کی اطاعت جو مبنی برانصاف ہوں؛ کیوں کہ جب آپ کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ زبان حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد ہے جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو''اَوْفُوْ بِالْعُقُوْدِ ''(المائدۃ:۱)ایک اور موقع پر فرمایا گیا''اَوْفُوْ بِالْعَهْدِ '' (الاسراء:۳۴)یعنی''معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو''قانون شکنی کو اسلام جائز قرار نہیں دیتا، بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

چنانچہ ہمیں امام محمدؒ کے کلام کی تشریح کرتے ہوئے علامہ سرخسیؒ کی یہ بات ملتی ہے :

وفی الصلح یجب الوفاء بالشروط ۔ (۱)

---

(۱) شرح السیر الکبیر:۲/۱۱۵۔

جمہوری ممالک میں دستور کی حیثیت بھی دراصل مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان صلح کی ہے، معاہدہ میں کئے جانے والی شرطوں کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ اگر مسلمان قیدی سے دار الحرب کا حکمراں کوئی حلفیہ عہد لے لے، تو اس کو بھی پورا کرنا لازم ہے، چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

إذا استحلف ملكهم الاسير بالأيمان المغلظة أن لا يخرج إلى بلاد المسلمين فحلف على ذلک ، فاليمين لازمة ۔(۱)

فقہاء نے تو اہل حرب سے بھی بغیر جزیہ کے موادعت کی اجازت دی ہے، جیسا کہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

قلت : أرأيت قوما من اهل الحرب طلبوا إلى المسلمين الموادعة سنين معلومة بغير جزية ، أينبغي للمسلمين أن يعطوهم ذلک ؟ قال : نعم ينبغي لامام المسلمين أن ينظر في ذلک ، فان كانت لهم شوكة لا يستطيعهم و كانت موادعتهم خيرا للمسلمين وادعهم ۔(۲)

امام محمدؒ کے یہاں ہمیں اس کی بھی صراحت ملتی ہے کہ اگر کسی ملک میں حکمراں کا پہلے سے کوئی قانون موجود ہو اور صلح میں شامل ہو کہ ہم اس میں مداخلت نہیں کریں گے، تو مسلمانوں کو اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے :

ملک من ملوک أهل الحرب له أرض واسعة ، فيها قوم من أهل مملكته ، هم عبيد له ، يبيع منها ماشاء ، ثم صالح المسلمين وصار ذمة لهم ، فإن أهل مملكته عبيد له كما كانوا يبيعهم إن شاء ۔(۳)

ایک جمہوری ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ مل کر سیاست میں حصہ لینا اور حسب موقع اقتدار میں شریک وسہیم بننا موادعت کی زیادہ باعزت شکل ہے، جس میں بہت سی دفعہ مسلمان اقلیت میں رہنے کے باوجود اقتدار کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچ سکتے ہیں، جیسا کہ ہندوستان کے مسلمان اس کا تجربہ کر رہے ہیں اور ضروری ہے کہ ایسی صورت میں ہم باہمی معاہدات کا احترام کریں۔

ظلم کی مخالفت میں باہمی تعاون

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدِ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے،

(۱) شرح السير الكبير:۴/۲۲۳۔

(۲) كتاب السير والخراج والعشر:۱۵۳،باب موادعة أهل الحرب۔

(۳) السير الصغير:۲۹،باب صلح الملوک والموادعة۔

رسول اللہ ﷺ نے منکر کو روکنے کے طریقہ کار کے سلسلہ میں یہ اُصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہوتو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا، تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے، تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا :

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده ، ومن لم يستطع فبلسانه ، ومن لم يستطع فبقلبه ، وذلک أضعف الإيمان ۔ (۱)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہئے کہ بزور بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہوتو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہوتو دل سے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج کرنا شامل ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے؛ لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔ (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔(۲)

غیر مسلموں سے مصالحت کی صورت میں ظالمانہ شرطوں کے قابل قبول نہیں ہونے کی صراحت امام محمدؒ کے یہاں ملتی ہے :

وإن كان حين طلب الذمه ، طلبها على أن يترک ، يحكم فی أهل مملكته بماشاء من قتل أو صلب أوغير ذلک مما لا يصلح فی أهل الإسلام لايجاب إلى ذلک ، فإن أعطي الصلح والذمة على هذا ، بطل من شروطه مالا يحل في الاسلام ۔ (۳)

---

(۱) مسلم، حدیث نمبر:۴۹۔

(۲) مجمع الزوائد:۱۲۶/۸، باب ماجاء في أذى الجار۔

(۳) السير الصغير:۲۹-۳۰، باب صلح الملوک والموادعة۔

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں تعلیمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان دونوں نکات کی کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شریعتِ اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

''اعتقادات'' سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب و ضمیر سے ہو، جیسے: توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد (Personal Law) ہے، اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق و فرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات و معاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آجاتے ہیں اور سود و قمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لئے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے؛ البتہ جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہیں، یا جرم و سزا سے متعلق ہیں جیسے حدود، قصاص، نظام مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، جمہور کا مسلک یہی ہے اور یہی نقطۂ نظر امام محمدؒ کا ہے(۱)؛ البتہ امام اوزاعیؒ امیر جیش کو اپنے فوجیوں پر اجراء حد کی اجازت

---

(۱) دیکھئے: كتاب السير والخراج والعشر، باب إقامة الحدود: ۱۴۰۔

دیتے ہیں(۱)، پس غیر مسلموں سے تعلقات مذکورۃ الصدر قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے ۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ گم نہ کرلیں؛ بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے :

لیس منا من تشبه بغیرنا ، لاتشبھوا بالیھود ولا بالنصاری الخ ۔(۲)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہوسکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں ان کو استعمال کریں — فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے ’’ولو وضع علی رأسه قلنسوۃ المجوس کفر ‘‘۔(۳)

اسی طرح کی بات فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت، یہ اگر یونہی ہو، یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضا مندی کا اظہار اور تائید وتحسین مقصود ہو تو کفر ہے ’’إنما الرضا بالکفر مستحسنا کفر ‘‘(۴) کیوں کہ آدمی جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضا مندی و خوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دوعملی اور نفاق کی بات ہے، اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

---

(۱) دیکھئے: موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ: ۲۹۵۔

(۲) ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان۔

(۳) الملتقط فی الفتاویٰ الحنفیة: ۲۴۵۔ (۴) الملتقط: ۲۴۵۔

(ج) تیسرا درجہ تہذیبی تشبہ کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس قسم کے تشبہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔(۱)

لیکن تشبہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے، تو پھر تشبہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (۲) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساڑی کے متعلق یہی لکھا ہے۔(۳)

(د) جو ملبوسات، وضع قطع اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، یا انتظام وانصرام سے متعلق اُمور جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم ونسق، تجارتی طور وطریق وغیرہ، ان میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمرؓ نے حساب وکتاب کے نظام میں روم وایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا(۴) آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔(۵)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے اُمور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

غیر مسلموں سے تشبہ کی ممانعت فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، اگر چہ امام محمد اور امام اوزاعیؒ کے یہاں تشبہ کی مختلف صورتوں کے بارے میں اتنی تفصیل نہیں ملتی، جس کا میں نے ذکر کیا؛ لیکن اُصولی طور پر اس کی ممانعت فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے۔

تشبہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اُصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد تہذیبی ہمہ رنگی کو برقرار رکھنا ہے، اسی لئے وہ دوسری قوموں سے بھی اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ مسلمانوں کی وضع قطع کو اختیار کریں۔

اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا اتھاہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی

(۱) دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۹۴/۱۔ (۲) امداد الفتاویٰ: ۲۶۸/۴، سوال نمبر: ۳۴۵۔
(۳) کفایة المفتی: ۱۶۱/۹۔ (۴) الفاروق: ۱۳۰/۲۔
(۵) البدایة والنهایة: ۹۵/۴۔

شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں، اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جاتی ہے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی اُمور میں عدم مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر وتشدد جائز نہیں :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کرلے، آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتا رہا، حضرت عمرؓ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے ''لَا اَكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ '' یہاں تک کہ وفات کے قریب آپؓ نے اس کو آزاد کردیا۔(۱)

اسی لئے فقہاء متفق ہیں کہ کسی شخص کا اسلام قبول کرنا ایک اختیاری عمل ہے، اس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، امام اوزاعیؒ نے لکھا کہ بالغ، عاقل، مختار شخص کا ہی اقرار شہادتین معتبر ہے، اس کے بغیر اگر کوئی شخص خوف سے بعض اسلامی اعمال کو کرنے لگے، تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہوگا، یعنی اگر اس کے بعد وہ کافروں کے سے افعال کرنے لگے تو وہ مرتد نہیں شمار کیا جائے گا اور حد ارتداد اس پر جاری نہیں کی جائے گی :

---

(۱) کتاب الأموال:۱/۱۵۴۔

یصیر المرء البالغ العاقل المختار مسلما بالنطق بالشهادتين إجماعاً ، ولكنه لا يصير مسلما بفعله أفعال المسلمين كالصلاة والحج وغيرهما ، قالؒ : إن أم الكافر المسلمين وهم لا يعلمون ، فعليهم إعادة الصلاة ، وصلاته هذه لا تكون إسلاما إذا لم يتكلم بالإسلام قبل الصلاة ، وقال : إن صحب الكافر المسلمين ، فصلى معهم ، ثم ترک الصلاة ، وقال : إنما صليت لأني خفت على نفسي لا يقتل بذلک ، لأنه لا يصير مسلماً بالصلاة ـ (۱)

مذہب پرعمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیرمسلموں کو اپنے مذہب پرعمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے،قرآن مجید نے صاف طور پرحضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کوکہلایا ہے’’لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ‘‘(الکافرون:٦) ’’تمہارے لئےتمہارا دین ہےاورمیرے لئے میرا دین‘‘ ایک اورموقع پرارشاد ہے’’لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ‘‘(الشوریٰ:۱۵)’’ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اورتمہارے لئےتمہارے اعمال‘‘رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضرہوا،تو آپ نے ان کوان کے مذہب کے مطابق اوران کےقبلہ کی طرف رُخ کرکےمسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔(۲)

فقہاء نےلکھا ہے :

> اگرکسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہواوراس کےعقیدہ کےمطابق کسی خاص دن روزہ رکھناواجب ہوتومسلمان شوہراسےروزہ رکھنے سےروک نہیں سکتا ہے،گواس کی وجہ سےوہ جنسی استفادہ کےحق سےمحروم ہوتا ہے۔(۳)
>
> اسی طرح اگر وہ اپنےعقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کےگھر میں صلیب رکھےتواسے یہ حق ہےاورشوہراس کواس سےروک نہیں سکتا۔(۴)

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ:۱۵۱/۱۔

(۲) أحكام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔

(۳) أحكام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔

(۴) أحكام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔

امام محمدؒ نے بھی اس سلسلے میں بعض اُمور کی صراحت کی ہے، مثلاً :

وكذلك ضرب الناقوس لم يمنعوا منه إذا كانوا يضربونه في جوف كنائسهم القديمة فإن أرادوا الضرب بها خارجا ، فليس ينبغى أن يتركوا ليفعلوا ذلك لما فيه من معارضة اذان المسلمين في الصورة ، فاما كل قرية أو موضع ليس بمصر من أمصار المسلمين فإنهم لا يمنعون من إحداث جميع ذلك فيها وإن كان فيها عدد من المسلمين نزول ۔(۱)

مذہبی مقدس شخصیتوں کو برا بھلا نہ کہا جائے

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

مذہبی شخصیتوں کے احترام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مذہبی پیشواؤں جیسے راہبوں کو جنگ کے دوران بھی قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ امام اوزاعیؒ کا نقطۂ نظر اس طرح منقول ہے :

لا يجوز قتل الرهبان فى الحرب الا ان يكون لهم ضلع فيها ۔(۲)

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہوں —— خواہ کسی مذہب کی ہوں —— ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا اس میں یہ صراحت

(۱) شرح السير الكبير:۲۵۲/۳۔

(۲) موسوعة الإمام الأوزاعيؒ ، ماده : راهب۔

فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی (۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔(۲)

فقہاء کے یہاں بھی اس کی صراحت ملتی ہے؛ چنانچہ امام اوزاعیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے :

لا يجوز قطع أشجار العدو ولا تحريقها ولا هدم بيته ولا كنائسه ولا بنيانه إلا أن يتخذها معاقل له يرمينا منها ۔ (۳)

بلکہ فقہاء نے بعض شرائط اور حدود و قیود کے ساتھ مسلمان ملک کے غیر مسلم شہریوں کو اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی بھی اجازت دی ہے؛ چنانچہ امام محمدؒ کا بیان ہے :

...... فإن عطل المسلمون هذا المصر حتى تركوا إقامة الحدود والجمع فيها ، فلأهل الذمة أن يتخذوا فيها ما أرادوا من الكنائس وأن يظهروا بيع الخمر والخنزير فيها ۔(۴)

اسی طرح جو قدیم عبادت گاہیں ہوں، ان کی تعمیر نو بھی جائز ہوگی، بقول امام محمدؒ :

فإن انهدمت كنيسة من كنائسهم القديمة ، فلهم أن يبنوها كما كانت ۔ (۵)

اسی طرح پہلے سے ان کی جو عبادت گاہیں قائم ہوں، اگر وہاں غالب آبادی غیر مسلموں کی ہو، تو وہ عبادت گاہیں باقی رہیں گی؛ بلکہ ان کو نئی عبادت گاہیں بنانے کی بھی اجازت ہوگی؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

فأما المصر الذى الغالب عليه أهل الذمة مثل الحيرة وغيرها ليست فيها جمعة ولا حدود تقام ، فإنهم لا يمنعون من إحداث ذلك فيها ...... وإذا اشترى قوم من أهل الذمة فيها منازل ، واتخذوا فيها الكنائس والبيع وأعلنوا فيها بيع الخمر و الخنزير لم يمنعوا من ذلك ۔ (۶)

---

(۱) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۳۰۴۱۔ (۲) موسوعة الخراج:۱۴۳۔

(۳) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۲، فتح الباری :۹۵/۶۔

(۴) شرح السير الكبير:۲۵۷/۳۔

(۵) شرح السير الكبير:۲۵۳/۳۔

(۶) شرح السير الكبير:۲۵۲/۳۔

البتہ جزیرۃ العرب کا علاقہ اس سے مستثنیٰ ہے؛ کیوں کہ اس کی حیثیت پوری ملت اسلامیہ کے ایمانی دارالخلافہ کی ہے؛ اس لئے وہاں ایک سے زیادہ قبلہ کی گنجائش نہیں، چنانچہ امام محمدؒ رقمطراز ہیں :

> **ولیس ینبغي أن یترک في أرض العرب کنیسة ولا بیعة ولا بیت نار فی شيء من الأمصار والقری، وکذلک لا ینبغي أن یظهر فیها بیع الخمر والخنزیر بحال من الأحوال ۔ (۱)**

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ کلام کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور روادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہہ در تہہ دبیز پردے ڈال دیئے گئے ہیں ۔

فوجی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فوجی تعلقات بھی ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں سے جہاد میں مدد حاصل کریں؛ بلکہ اگر اہل ذمہ سے مدد لی جائے، تو مالِ غنیمت میں بھی مسلمان فوجیوں کے مساوی ان کا حصہ ہوگا، چنانچہ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

> **لا أکره أن یستعان بأهل الشرک علی قتال أهل الشرک إن کان حکم الإسلام هو الغالب الجاري علیهم، وإنما یکره إن کان حکم الشرک هو الظاهر، فإذا قاتل أهل الذمة مع المسلمین، استحقوا من الغنیمة سهما کسهم المسلمین ۔ (۲)**

یہی بات امام محمدؒ نے بھی لکھی ہے :

> **لا بأس بأن یستعین المسلمون بأهل الشرک علی أهل الشرک إذا کان حکم الإسلام هو الظاهر علیهم ۔ (۳)**

اسی طرح اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ اگر حربی غیر مسلموں کی اپنے مذہب کے لوگوں سے لڑائی ہو،

---

(۱) شرح السیر الکبیر: ۳/۲۵۷ ۔

(۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ: ۲۸۸، تفسیر قرطبی: ۸/۱۸ ۔

(۳) السیر الکبیر مع شرح السرخسی: ۳/۱۸۶ ۔

تو مسلمان ان کی مدد کریں؛ البتہ اگر وہ کسی اور مسلمان ملک سے جنگ کر رہے ہوں، تو مسلمانوں کے لئے ان کے ساتھ جنگ میں تعاون کرنا جائز نہیں :

> **یجوز للأسیر أن یقاتل مع العدو من خالفه من أهل ملته — أی ملة الکفر — ویفهم من هذا أنه لا یجوز له أن یقاتل المسلمین مع الکفار ، أما المسلم المستامن في دیار الکفر، فلا یجوز له أن یقاتل مع الکفار إلا أن یشترطوا علیه ، إن غلبوا أن یردوه إلی دار الإسلام ۔(۱)**

جو لوگ اس کو درست قرار دیتے ہیں، ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ مہاجرین حبشہ نے نجاشی کی فوج کے ساتھ اس جنگ میں شرکت کی تھی، جو اس کی اپنی ہی قوم سے واقع ہوئی تھی (۲) — البتہ امام محمدؒ کا رجحان اس طرف ہے کہ مسلمانوں کو دارالحرب کی حکومت کی مدد بہر حال نہیں کرنی چاہئے، چاہے وہ دوسرے غیر مسلم گروہ ہی کے مقابل کیوں نہ ہو۔(۳)

جہاد — حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے ''جہاد'' جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے، اسے تہہ تیغ کر دیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل۔

جہاد تمام غیر مسلموں سے نہیں ہے؛ بلکہ ان غیر مسلموں سے ہے، جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> **قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔** (البقرۃ :۱۹۱)
>
> اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۸۹۔

(۲) دیکھئے:شرح السیر الکبیر:۱۸۶/۳،باب الاستعانة بأهل الشرک واستعانة المشرکین للمسلمین۔

(۳) دیکھئے:کتاب السیر:۱۸۱، باب القوم یکونون مستامنین في دار الحرب۔

اس آیت میں ’’حد سے تجاوز کرنے‘‘ کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اول یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدینؓ نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

ایک اور موقع پر قرآن مجید نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن سے جہاد کا حکم ہے کہا ہے :

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۔ (محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

قرآن مجید نے اس بات کو دوسری جگہ بہت ہی وضاحت سے کہا ہے :

اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصۡرِهِمۡ لَقَدِیۡرُ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ (الحج:۴۰-۳۹)

ان لوگوں کو جو جنگ کررہے ہیں، جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق محض یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَیۡكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَیۡهِمۡ سَبِیۡلًا ۔ (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیشکش کریں، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا ۔ (الانفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

---

(۱) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۲۶۱۴۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پرامن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی واخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف بھی قتال کرنا اور عہد کو توڑ نا دینا درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے :

> وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَّاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (الانفال:۷۲)
>
> اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں، تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو، یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ پوری طرح انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

> لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْا فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنة:۸)
>
> جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

قرآن مجید کے ان بیانات کی روشنی میں فقہاء اسلام خصوصاً امام اوزاعیؒ اور امام شیبانیؒ کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) اہل ذمہ سے قتال جائز نہیں؛ کیوں کہ ہمارا ان سے معاہدہ ہو چکا ہے، یہاں تک کہ امام محمد کا خیال

ہے کہ اگر اہل ذمہ کا کوئی گروہ نقض عہد پر اتر آئے؛ لیکن مسلمان وہاں مامون ہوں، تو ان کو قابو میں تو کیا جائے گا؛ لیکن ان کے ساتھ محاربین کا سا سلوک نہیں کیا جائے گا :

قلت : أرأيت القوم من أهل الذمة إذا نقضوا العهد وحاربوا المسلمين وغلبوا على مدينتهم ، فكان حكمهم فيها جائز ، غير أن فيها ناسا من المسلمين آمنين ، فظهروا عليهم ، هل تسبيهم ؟ قال : لا ، قلت : لم ؟ قال : لأن الدار لم تصر دار حرب ، ألا ترى أن المسلمين فيها آمنون ، وهي دار الإسلام التي كانت عليها ، يعد على حالها ۔(۱)

(۲) امام محمدؒ کی صراحت کے مطابق محاربین سے تینوں قسم کی شرطوں پر صلح کی جاسکتی ہے :

(الف) نہ مسلمان غیر مسلموں کو کچھ ادا کریں، نہ غیر مسلم مسلمان کو، کچھ لئے دیئے بغیر صلح ہوجائے۔

(ب) غیر مسلم مسلمانوں کو معاہدہ کے مطابق بدل صلح ادا کریں۔

(ج) مسلمان غیر مسلم ممالک کو صلح کا بدل ادا کریں۔

بہر حال جو بھی صورت ہو، جب تک معاہدہ باقی ہے، مسلمانوں کے لئے ان پر حملہ کرنے کی گنجائش نہیں :

والموادعة التى جرت بين الفريقين ، فان قتالهم بعد ها من غير نبذ يكون غدراً للأمان ، وذلک حرام ۔ (۲)

اگر کسی وجہ سے معاہدہ باقی نہیں رکھا جاسکتا، تب بھی مسلمان ملک کا فریضہ ہے کہ وہ اس معاہدہ کے ختم ہونے کی باضابطہ طور پر اطلاع کردے اور جب تک دشمن ملک اس سے واقف نہ ہوجائے، اس وقت تک حملہ نہ کیا جائے، چنانچہ امام محمدؒ نے لکھا ہے :

ولو بدا للإمام بعد الموادعة أن القتال خير ، فبعث إلى ملكهم ينبذ اليه ، فقد صار ذلک نقضاً ...... ولكن لا ينبغي للمسلمين أن يغيروا عليهم ولا على أطراف مملكتهم حتى يمضي من الوقت مقدار ما يبعث الملک إلى ذلک الموضع من ينذرهم ...... وبعد المضي لا بأس بالإغارة عليهم وإن لم يعلم المسلمون أن الخبر أتاهم ، ولكن إن علم المسلمون يقينا أن القوم لم ياتهم خبر ، فالمستحب لهم أن

(۱) کتاب السیر والخراج والعشر:۲۰۰،باب نقض اهل الذمة۔

(۲) شرح السیر الکبیر:۱۶/۴۔

لا يغيروا عليهم حتى يعلموهم ۔(۱)

اوراگر مسلمان ملک نے صلح کرنے والے ملک سے صلح کے بدلہ میں کچھ مال حاصل کیا تھا،تو یہ بھی ضروری ہے کہ جو مدت ابھی باقی ہو،اس کا بدلِ صلح واپس کردے :

وإن كانت الموادعة على جعل ، فله أن ينقضها متى شاء أيضا ، ولكن يرد عليهم بحصة مابقي من المدة من الجعل حتى لو وادعهم ثلاث سنين على ثلاثة آلاف دينار و قبضها كلها ، ثم أراد نقض الموادعة بعد سنة ، فعليه رد ثلثي المال ۔(۲)

نیز جس ملک سے معاہدہ امن ہو،اگر وہاں کی حکومت نے معاہدہ شکنی نہیں کی ؛لیکن کچھ افراد نے اپنے طور پر مسلمانوں پر حملہ کیا،تو یہ ان کی طرف سے نقض معاہدہ نہیں سمجھا جائے گا اور مسلمانوں کے لئے اس حکومت پر حملہ کرنا درست نہیں ہوگا،جیسا کہ امام محمدؒ نے لکھا ہے :

وإذا وادع الإمام أهل دار الحرب فخرج رجل من أهل تلک الدار ، فقطع الطريق في دار الإسلام وأخاف السبيل فأخذه المسلمون ، فليس هذا بنقض منه للعهد ، وكذلک العدد منهم إذا فعلوا ذلک ولم يكونوا أهل منعة ، فهذا والواحد سواء ، فإن كانوا أهل منعة فعلوا ذلک فی دار الإسلام علانية بغير أمر من ملكهم وأهل مملكته ، فهولاء ناقضون للعهد فاما الملک وأهل مملكته ، فهم على موادعتهم ، وإن كانوا خرجوا بإذن ملكهم ، فقد نقضوا جمعياً العهد ، فلا باس بقتلهم وسبيهم حيثما وجدوا ۔(۳)

مسلمان فقہاء نے موادعین کے بارے میں اس قدر فراخ دلی سے کام لیا ہے کہ جاسوسی کو بھی نقض عہد قرار نہیں دیا ہے :

...... فإن صار ذمة ، ثم وقف منه على أنه يخبر المشركين بعورة المسلمين ويواري عيونهم لم يكن هذا نقضاً منه للعهد ولكنه يعاقب على هذا ويحبس ۔(۴)

---

(۱) السیر الکبیر مع شرح السرخسی:۴/۷۔ (۲) شرح السیر الکبیر:۴/۱۵۔

(۳) السیر الکبیر مع شرح السرخسی:۴/۶۔ (۴) السیر الصغیر:۳۰،باب صلح الملوک والموادعۃ۔

(۳) البتہ دارالحرب (دشمن ملک) جس کا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ نہ ہو، سے جہاد کرنا جائز ہے، اس سلسلے میں امام اوزاعی نے لوگوں کی تین قسمیں کی ہیں اوران کے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں، ڈاکٹر رواس قلعہ جی نے ان کے افکار کا خلاصہ اس طرح ذکر کیا ہے :

الشعوب من حيث اديانها على ثلا ثة انوا ع ، شعوب مسلمة ، قد جعل الله تعالىٰ الحاكمية لها عندما قال في سورة النساء : ۱۴۱ ''ولن يجعل الله للكافرين على المومنين سبيلاً '' وشعوب لها أنبياء معرفون و شرائع معروفة ـــ ضاع بعضها وحرف بعضها وما بقي من أُصولها ، فهو القليل ـــ وهذه الشعوب لا يجوز قتالها إلا أن يخشى منها الغدر عملاً بقوله تعالىٰ في سورة الأنفال : ۵۸'' وإما تخافن من قوم خيانة فانبذ إليهم على سواء '' وشعوب ليس لها أنبياء يعرفون ولا أثر من شرائع باقية ، كالفرازنة والترک وعبدة الأصنام والهنود وكل جاحد ومكذب بربوبية الله تعالىٰ وهٰولاء يقاتلون ـــ إنقاذا لهم مما فيه من الضلال وتحريراً لعقولهم ـــ حتى يسلموا أو يعطو الجزية ، فإن بذلو الجزية ، قبلت منهم ، وكانوا كالمجوس في تحريم مناكحتهم وذبائحهم و سائر أمورهم ۔(۱)

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ عین جنگ کے ماحول میں بھی اسلام نے مسلمانوں کو مہذب اور منصفانہ قانون کا پابند بنایا ہے، اس سلسلے میں چند نکات یہاں ذکر کئے جاتے ہیں، جن کی امام اوزاعیؒ یا امام محمدؒ نے صراحت کی ہے۔

اگر فریقین کے درمیان اس طور پر جنگ بندی ہوئی ہو کہ مسلمانوں نے دشمن طاقت سے کچھ افراد کو بطور ضمانت کے اپنے قبضے میں لیا ہو، تو چاہے دشمن دھوکہ دے؛ لیکن مسلمان اپنے عہد پر قائم رہیں گے اور انھیں قتل نہیں کریں گے۔

...... ان أخذ المسلمون من العدو رهائن ، فغدر العدو ، قال الأوزاعي : لا تقتل الرهائن بغدرهم ۔(۲)

یہاں تک کہ امام محمد نے صراحت کی ہے کہ اگر دشمن طاقت نے ہمارے رہائن کو قتل کر دیا ہو، تب بھی

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۸۷۔

(۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعي:۲۹۵،كتاب الأموال ، لأبي عبيد :۱۶۲۔

ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہم ان کے رہائن کو قتل کردیں، چنانچہ فرماتے ہیں :

فإن غدر المشركون وقتلوا رهن المسلمين ثم قتل المسلمون رهنهم اعتمادا على ظاهر الشرط فقد أخطأ وا فى ذلک ؛ لانهم كانوا مستامنين فينا ، و ينبغي لمن قتلهم أن يغرم دياتهم كما هو الحكم في المسلم يقتل المستامن ۔(۱)

جن لوگوں کا جنگ سے براہ راست تعلق نہ ہو یا وہ جو جنگ میں حصہ لینے سے عاجز ہوں، جنگ میں بھی ان کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں امام اوزاعی کے نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے :

ولا يقتل في الحرب السكان الآمنون الذين لا ضلع لهم في الحرب ، ومنهم الذين يحرثون الأرض ويزرعونها ، والشيخ الكبير والمجنون ، والراهب والمرأة والصغار مالم يقاتلوا ، فمن قاتل من هولاء يقتل ، ولا يقتل من يدعى الحصول على الأمان ، فإن ادعىٰ الكافر أنه قد امن او قال لمن أخذه ، انما وقفت لندائک ، فهو آمن ، فان لم يد ع ذلک ، فلا يقبل ۔(۲)

اسی طرح امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

سألت أبا حنيفة عن قتل النساء والصبيان والشيوخ الذين لا يقدرون على القتال والذين بهم زمانة ، لا يطيقون قتالاً ، فنهى عن ذلک وكرهه ۔ (۳)

ایک اور موقعہ پر امام محمدؒ نے لکھا ہے :

ولا يقتل الأعمىٰ والمقعد والمعتوه من الأسرى ۔(۴)

اسی طرح عین جنگ کے درمیان بھی انسانی پہلو کو ملحوظ رکھا جائے گا، من جملہ اس کے یہ ہے کہ مقتولین کی لاش برہنہ نہیں کی جائے گی؛ چنانچہ امام اوزاعیؒ کے بارے میں منقول ہے :

قد قيل له : أيتركون عراة ؟ فقال أبعد الله عورتهم وكره أن يتركوا عراة ۔(۵)

---

(۱) شرح السير الكبير:۵۲/۴۔ (۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ:۲۹۱۔

(۳) السير الصغير:۵۸۔ (۴) السير الصغير:۲۰۔

(۵) موسوعة فقه الإمام الأوزاعيؒ:۲۴۵۔

اسی طرح دشمن کے علاقہ کے درخت اور باغات بلا وجہ کاٹنا یا جلانا جائز نہیں، چنانچہ امام اوزاعی فرماتے ہیں :

لا یجوز قطع أشجار العدو ولا تحریقها ۔(۱)

اسی طرح بلا وجہ دشمن کے جانور کو مار ڈالنا اور ذبح کر دینا بھی درست نہیں؛ چنانچہ امام اوزاعی کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

لا یجوز عقر حیوان العدو لمجرد مغایظة العدو أو إلا فساد علیهم ویجوز عقره للأکل ، قال : نهی أبو بکر أن تعقر بهیمة إلا لماکلة ، وأخذ بذلک أئمة المسلمین وجماعتهم ، حتی إن علماء هم کانوا یکرهون للرجل ذبح الشاة والبقرة لیاکل طائفة منها ویدع سائرها ۔(۲)

حیاتِ نبوی ﷺ اور جہاد

مستشرقین کے پروپیگنڈوں کے پس منظر میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے ایک معتبر سیرت نگار کے بیان کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئی ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ایک ہزار اٹھارہ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی مقدس جنگ میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، انھوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا :

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

جزیہ کی حقیقت

اسلام کو بدنام کرنے کے لئے جزیہ کے مسئلہ کو بھی اُٹھایا جاتا رہا ہے، اہل علم نے تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۲۔ (۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۲۔

حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی، تو یہ انھیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا، اس لئے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس ''جزیہ'' کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کے حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور ان سے بڑھ کر مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے (۱)، اس لئے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے، نہ کہ تاوان کی، پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟

کم آمدنی والوں کے لئے سالانہ بارہ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لئے سالانہ ۲۴ اور زیادہ آمدنی والوں کے لئے ۴۸ درہم۔(۲)

۱۲ درہم ۳ تولہ سے کم چاندی ہوتی ہے، آپ حضرات خود غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکوریٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومتیں اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردیں اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرلیں تو ہم شکرگذار ہوں گے، یہ ہے اس جزیہ کی حقیقت، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم وزیادتی، تشدد اور ناروا داری کا عنوان دیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور ناروادار مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم وفراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے مسکن رحمت ہے۔ **إن الدين عند الله الإسلام ۔**

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ۔

○ ○ ○

(۱) دیکھئے: أحكام أهل الذمة: ۱/۱۴۸، الهداية: ۴/۳۱۸، باب الجزية، نیز دیکھئے: السير الصغير للشيباني: ۲۶۔
(۲) بيهقي: ۹/۳۲۹، حدیث نمبر: ۱۸۶۸۵، باب الزيادة على الدينار بالصلح۔

اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے اکیسویں اجلاس کے فیصلے

(منعقدہ: ۲۴ - ۲۸ رمحرم ۱۴۳۴ھ، ۸-۱۲ ردسمبر ۲۰۱۲ء)

ترجمہ: مولانا سید عبدالرشید ●

سرمایہ کاری کے طور پر باقی دین میں زکوٰۃ

(۱) جن موجل قرضوں کے ادا ہونے کی اُمید نہ ہو، خواہ کسی سبب سے ہو، مثلاً قرض دار دیوالیہ ہو، یا ٹال مٹول سے کام لے رہا ہو، یا قرض کا انکار کررہا ہو، تو ان کی زکوٰۃ واجب نہیں، اور اگر قرض دہندہ کو یہ قرض بعد میں مل جائے تو نئے سرے سے سال شروع کرے گا (یعنی سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی)۔

(۲) سرمایہ کاری میں مشغول طویل المیعاد قرضے —— جن کے ادا ہونے کی اُمید ہو —— ان میں ہر قمری سال کے گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ وقتی قرضوں میں واجب ہوتی ہے۔

(۳) سرمایہ کاری میں مشغول قسط وار اصل قرضہ کی زکوٰۃ اس سال کے منافع کے ساتھ ادا کرے گا، جس میں زکوٰۃ نکال رہا ہے، نہ کہ اگلے سالوں کی زکوٰۃ۔

(۴) اگر قرض کئی سالوں کے لئے موجل ہو، اور یک مشت ملنے والا ہو تو اس کی زکوٰۃ کو قبضہ میں آنے تک کے لئے موخر کرنا جائز ہے، اور اسی وقت گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

مفقود الخبر کے انتظار کی مدت

(۱) مفقود الخبر وہ شخص ہے جس کے بارے میں تمام اطلاعات منقطع ہو چکی ہوں، اور اس کی موت یا حیات کا کوئی علم نہ ہو۔

(۲) مفقود الخبر کی حیات یا موت پر بہت سے فقہی احکام مرتب ہوتے ہیں، جن کا تعلق اس کے خاندان اور اموال وجائداد سے ہے، اس مسئلہ پر پیش کئے گئے مقالات اور مناقشات کا جائزہ لینے کے بعد اکیڈمی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے، اور قرآن وحدیث میں اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہے؛ البتہ صحابہ کرام سے بعض آثار واقوال صحیح طور پر ثابت ہیں۔

● استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۳) اور شریعت میں دین، جان، آبرو، نسب اور مال کی حفاظت وسلامتی کے عمومی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے، اور حرج اور تنگی کو دور کرنے، ضرر کو دفع کرنے، نیز انساب اور نکاح کے معاملات میں احتیاط کو ملحوظ رکھنے کے جو شرعی مقاصد ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمیٹی نے درج ذیل فیصلے کئے ہیں :

(الف) اصل یہ ہے کہ مفقود الخبر کے معاملہ میں انتظار کیا جائے، اس وقت تک اس کی موت کا حکم نہ لگایا جائے، جب تک کہ پختہ طور پر اس کی موت یا زندگی کا حال معلوم نہ ہو جائے اور انتظار کی مدت کی تعیین قاضی کرے گا، جو کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ چار سال ہوگی، مفقود کے احوال معلوم کرنے کے لئے وہ ابلاغ اور رابطہ کے ممکنہ تمام جدید ذرائع استعمال کرے گا، اور ہر شخص کے مسئلہ میں اس کے مخصوص حالات کی رعایت ملحوظ رکھے گا اور اس معاملہ میں اپنے غالب گمان کے موافق فیصلہ دے گا۔

(ب) مقرر کردہ مدت کے گذرنے کے بعد قاضی مفقود الخبر کی موت کا فیصلہ جاری کرے گا، اس کے اموال اور جائداد کی تقسیم عمل میں آئے گی، اس کی بیوی عدت گذارے گی، اور شریعت میں کسی کی موت پر جو احکام مرتب ہوتے ہیں، وہ لاگو ہوں گے۔

(ج) زوجہ کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کو انتظار کی مدت سے ضرر لاحق ہو رہا ہو تو اس ضرر کے پیش نظر مفقود الخبر شوہر سے علاحدگی کے لئے اپنا معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرے؛ تا کہ قاضی اس نوع کی علاحدگی کے لئے شریعت میں مقررہ شرطوں کے مطابق دونوں میں تفریق کرادے۔

۴۸ تا ۶۶ ڈگری شمالی وجنوبی عرض البلد کے درمیان واقع ملکوں میں اوقاتِ نماز کا مسئلہ

اس سے متعلق سوالات پر غور وخوض ہوا، انیسویں اجلاس میں ۴۸ ڈگری تا ۶۶ ڈگری شمالی اور جنوبی عرض البلد کے درمیان واقع ہونے والے ملکوں میں اوقات نماز کے بارے میں کئے گئے دوسرے فیصلہ کے آخری فقرہ کی توضیح وتشریح کے بارے میں تھے، جس کی عبارت تھی :

> اس پوری مدت کے دوران ان ملکوں کے تمام باشندوں کے لئے جمع بین الصلاتین جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کی اجازت کو عزیمت میں تبدیل کرنا لازم آئے گا، اور اکیڈمی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس حالت میں قریبی ملک کا اندازہ کرنے کے قول کو اختیار کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

مذکورہ بالا فیصلہ کی مزید توضیح کے لئے اکیڈمی واضح کرتی ہے کہ :

(الف) اکیڈمی گذشتہ اپنے ان تمام فیصلوں کو مزید موکد کرتی ہے جو اس موضوع کے بارے میں پانچویں، نویں اور انیسویں اجلاس میں کئے گئے ہیں۔

(ب) انیسویں سیمینار کے فیصلہ کی جو عبارت ذکر کی گئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ علامت کے پائے جانے کی صورت میں جمع بین الصلاتین کی اجازت اس شخص کے لئے ہے، جس کو جمع کے ترک کرنے کی صورت میں مشقت لاحق ہو، یہ حکم ان ملکوں کے تمام مسلمان باشندوں کے لئے رخصت اور اجازت کے طور پر نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر ان ملکوں میں تمام مسلمانوں کے لئے جمع بین الصلاتین کو اصل قرار دے دیا جائے گا تو اس سے رخصت کو عزیمت میں تبدیل کرنا لازم آئے گا، اور یہ علمائے اُمت کے اس مقررہ قاعدہ کے مغائر ہے کہ سبب کے پائے جانے کے وقت ہی رخصت پر عمل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

(ج) فیصلہ کی آخری عبارت ''اس حالت میں قریبی ملک کا اندازہ کرنے کے قول کو اختیار کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے'' کی مراد اکیڈمی کے نزدیک یہ ہے کہ جب حرج اور مشقت کی صورت میں مغرب اور عشاء کی نمازوں کے درمیان جمع کرنا جائز ہے، تو علامت کے نہ پائے جانے کے وقت قریبی ملک کا اندازہ کرنے کے قول کو اختیار کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

(د) اس وضاحت کے ساتھ اکیڈمی ان ملکوں میں مقیم باشندوں کو نصیحت کرتی ہے کہ وہ وحدتِ اسلامی اور اجتماعیت کو باقی رکھیں، نیکی اور تقوی کے کاموں میں آپس میں تعاون کریں، اور اختلاف وانتشار سے بچیں۔

نابالغ لڑکیوں کی شادی

نابالغ لڑکیوں کی شادی کے موضوع پر غور وخوض کیا گیا، اس موضوع پر پیش کئے جانے والے مقالات اور باحثین، مشارکین اور ارکان مجلس کی جانب سے اس پر کئے گئے مناقشات کی سماعت کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ موضوع مزید بحث وتحقیق، اور موضوع سے متعلق اعداد وشمار، نیز معاشرتی، نفسیاتی، طبی اور قانونی پہلوؤں کے مطالعہ اور اس بارے میں اسلامی ممالک میں جاری تعامل کی جانکاری کا محتاج ہے، اور چوں کہ اکیڈمی نے رابطہ کو مسلمان خاندان اور اس کو درپیش چیلنج کے موضوع پر کانفرنس منعقد کرنے کی ہدایت دی ہے؛ اس لئے اس موضوع پر کسی قطعی فیصلہ کو کانفرنس کے انعقاد اور اس کے نتائج کے سامنے آنے تک موخر کیا جاتا ہے۔

حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت

(الف) کتاب وسنت میں کوئی ایسی صریح نص وارد نہیں ہوئی ہے، جو حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کی تحدید کرے۔

(ب) حمل سے متعلق جدید میڈیکل سائنس نے لیباریٹری میں ہونے والے تجزیوں اور بالائے بنفشی

شعاوٴں کے ذریعہ ہونے والی تحقیقات سے ثابت کردیا ہے کہ رحم میں زندگی کا تسلسل نو ماہ سے زیادہ صرف چند ہفتوں کے لئے ہی ہوتا ہے، اور دسیوں ہزاروں بچے جن کی ابتدائے حمل اور ولادت کی تاریخ ریکارڈ کی گئی ہے، ان میں سے ایک حالت بھی ایسی نہیں تھی، جس کی مدت حمل اس سے زیادہ ہو۔

اور چوں کہ شریعت اسلامی علم جدید کے قطعی طور پر ثابت شدہ حقائق سے متعارض نہیں ہے؛ اس لئے اکیڈمی فیصلہ کرتی ہے کہ :

(الف) مدت حمل کی زیادہ سے زیادہ مقدار زوجین میں علاحدگی کی تاریخ سے ایک سال ہے؛ تاکہ مدت حمل کا حساب کرنے میں واقع ہونے والی غلطی کے امکان کو بھی شامل کرلیا جائے۔

(ب) حمل کے بارے میں کیا جانے والا کوئی بھی دعوی جو ایک سال کی مدت کے بعد کیا جائے، اس کا قطعی فیصلہ قاضی کے سپرد ہوگا، اور وہ اس سلسلہ میں کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے شریعت کی واقفیت رکھنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم سے مدد لے گا۔

طبیب کا زوجین میں سے کسی ایک کی میڈیکل رپوٹ سے دوسرے کو مطلع کرنا

اس موضوع پر پیش کئے جانے والے مقالات اور باحثین، مشارکین اور ارکان مجلس کی جانب سے اس پر کئے گئے مناقشات کی سماعت کے بعد مجلس اس بات پر زور دیتی ہے کہ :

راز کی حفاظت انتہائی اہم ذمہ داری ہے، اور بغیر کسی معتبر شرعی عذر کے کسی کے راز کا افشا کرنا حرام اور امانت میں خیانت ہے، اور جن رازوں کی حفاظت کرنا نہایت اہم اور واجب ہے، ان میں سے طبی راز یعنی صحت اور بیماری سے متعلق راز بھی ہیں، اس سے مراد وہ معلومات ہیں، جن سے دوران علاج طبیب اور اس شعبہ سے وابستہ اشخاص نرس، فارمیسسٹ اور اسپتال کا منتظم واقف ہوتا ہے، خواہ یہ معلومات مریض کی میڈیکل ٹیسٹ کی رپوٹ سے حاصل ہوں، یا مریض نے خود ان کا اظہار کیا ہو، یا ڈاکٹرس کی ٹیم نے وہ نتائج اخذ کئے ہوں، اس میں وہ معلومات بھی شامل ہیں، جو مریض کی تندرستی اور بیماری سے متعلق ہوں، یا اس کے ذاتی حالات سے، یا اس کی صحت کی تاریخ یعنی گذشتہ ادوار کے طبی احوال سے متعلق ہوں۔

اس لئے اکیڈمی فیصلہ کرتی ہے کہ :

(۱) اصل یہ ہے کہ مریض کے رازوں کو اس کے شریک زندگی سے چھپانا واجب ہے، اور میڈیکل ٹسٹ کی رپوٹ سے واقف کرانا حرام ہے، سوائے اس صورت کے، کہ فریق ثانی کو بتانا ناگزیر ہو، یا اس کی شدید ضرورت ہو؛ تاکہ جو مصلحت زیادہ اہم ہے، اس کی رعایت ہوسکے اور بڑے ضرر سے بچا جاسکے، مثلاً :

(الف) وہ امراض جو ایک کا دوسرے پر حق ثابت کریں، یا حق ساقط کریں، جیسا کہ زوجین میں سے کسی

ایک کے دوسرے کے خلاف پیش کئے گئے دعووں میں ہوتا ہے۔

(ب) وہ امراض جو زوجین کی ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہوں، خواہ وہ مرض نفسیاتی ہو، یا جسمانی۔

(ج) وہ امراض جو ان کی نسل کو شدید حد تک متاثر کر سکتے ہوں، یعنی وہ امراض جو موروثی نوعیت کے ہوں، جن کی وجہ سے بچہ معمول کی زندگی گذارنے کے قابل نہ رہے۔

(۲) طبیب کو چاہئے کہ وہ اس نوع کے امراض، موروثی بیماریوں اور ان سے محفوظ دوسرے فریق کو اس سے شادی نہ کرنے کا مشورہ دے، جس میں یہ امراض اور ان کے اسباب پائے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اکیڈمی اپنے سترہویں اجلاس میں کئے گئے فیصلوں کو مؤکد کرتی ہے، جو نکاح کے خواہش مند افراد کے لئے میڈیکل ٹسٹ کروانے سے متعلق ہے، وہ فیصلہ حسب ذیل ہے :

- نکاح ایک ایسا عقد ہے جس کی شرائط خود شارع حکیم نے متعین فرمائی ہیں اور نکاح پر اس کے شرعی نتائج مرتب کئے ہیں؛ لہٰذا شریعت نے جتنا کچھ حکم دیا ہے، اس پر اضافہ کا دروازہ کھولنا، جیسے نکاح سے قبل طبی تحقیقات کی شرط لگانا جائز نہیں ہے۔
- اکیڈمی کا اجلاس حکومتوں اور اسلامی اداروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ نکاح سے قبل طبی تحقیقات کی اہمیت کے بارے میں بیداری پیدا کریں، ایسی تحقیقات کے لئے ہمت افزائی کریں اور جو لوگ ان سے دلچسپی رکھتے ہوں، ان کے لئے تحقیقات کو آسان بنائیں، نیز ان تحقیقات کے نتائج کو صرف متعلقہ افراد تک محدود رکھا جائے اور ان کے علاوہ سے مخفی رکھا جائے۔

(۳) جن رازوں کی حفاظت کرنا اور ان کو چھپانا ضروری تھا، اور طبیب نے ان سے زوجین میں سے دوسرے فریق کو مطلع کر دیا، اور اس کے نتیجہ میں ازدواجی زندگی کو نقصان پہنچا، تو طبیب پر اس کی ذمہ داری ہوگی۔

زیر ولایت افراد کی بیماری وعلاج سے متعلق ولی کی ذمہ داری اور اس کا حق

اس موضوع پر پیش کئے جانے والے مقالات، مناقشات اور بحث ومباحثہ کی سماعت کے بعد، شریعت کے ان اُصولوں اور معتبر قواعد کو ملحوظ رہتے ہوئے کہ :

(الف) کسی انسان کے جسم پر علاج معالجہ کے عمل کو اس کی یا اس کے ولی کی اجازت کے بغیر جاری نہ کیا جائے؛ بشرطیکہ ولی موجود ہو، نیز اگر ولی قریب موجود نہ ہو تو ولایت اس کے دوسرے قریبی عزیز کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

(ب) ولی کی ذمہ داری ہے کہ وہ زیر پرورش شخص کی مصلحت کوملحوظ رکھتے ہوئے تصرفات انجام دے۔

اکیڈمی نے درج ذیل فیصلہ کیا ہے :

(۱) مریض کے ولی پر واجب ہے کہ اگر علاج میں مریض کی منفعت ومصلحت کا پہلو راجح ہے تو اس کی اجازت دے۔

(۲) اگر زیر پرورش شخص کی حالت اس قدر نازک ہو کہ علاج میں تاخیر کی گنجائش بالکل نہ ہو، جیسے: اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو، یا کسی عضو کے تلف ہوجانے یا اس کے بے کار ہوجانے کا اندیشہ ہو، تو اس صورت میں اس کی یا ولی کی اجازت پر اس کا علاج موقوف نہیں رہے گا۔

(۳) مریض کے ولی کو کسی ایسے آپریشن یا علاج کی اجازت دینا جائز نہ ہوگا، جس میں مریض کو ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، اگر ولی کسی ایسے علاج یا آپریشن پر اصرار کرے، جس میں زیر ولایت شخص کا ضرر ہو، یا ایسے علاج کی اجازت دینے سے انکار کرے، جس میں مریض کا فائدہ اور اس کی مصلحت ہو، تو اس صورت میں ولایت بالترتیب دوسرے قریبی عزیز (جس کو اس کی عدم موجودگی میں ولایت کا حق حاصل ہوتا ہے) کو منتقل ہوجائے گی۔

(۴) مریض کے لئے علاج اور آپریشن کے ضروری ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ایسے ڈاکٹروں کی ٹیم کے سپرد ہوگا، جو اپنے فن میں متخصص اور قابل اعتماد ہو۔

بعض مسلم معاشروں میں ملحدانہ افکار اور دین بیزار رویہ کی نشو ونما

رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامی فقہ اکیڈمی نے ۲۴ - ۲۸ رمحرم ۱۴۳۴ھ مطابق ۸-۱۲ ردسمبر ۲۰۱۲ءکو مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والے اپنے اکیسویں اجلاس میں ''دین میں تشکیک اور الحاد کی علامتوں کے ظہور اور ان کی نشو ونما'' کے مسئلہ پر غور کیا، جس میں ذات باری تعالی وتقدس کی جناب میں گستاخی، حق تعالی کا وجود، اور اس کی عبادت کے واجب ہونے، احکام خداوندی کی اطاعت لازم ہونے، شریعتِ مطہرہ کو اپنے معاملات میں فیصل بنانے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ربوبیت کو ماننے اور اسلام کو دین حق تسلیم کرنے کے بارے میں شکوک وشبہات، اسی طرح اللہ جل جلالہ کو پکارنے اور اس ذات عالی کے بارے میں گفتگو کرنے میں بے ادبی، نیز خاتم الانبیاءﷺ کی شان رسالت میں گستاخی شامل ہے۔

چوں کہ اُمتِ مسلمہ کے ایمان واعتقاد اور اس کے دینی اقدار ومقدسات کے تعلق سے یہ بات انتہائی خطرناک ہے، اور اس صورتحال کے مقابلہ کے لئے جلد از جلد کھڑا ہوجانا، مسلمانوں کو اس کی نزاکت سے واقف کرانا، اور اس کے تدارک کے لئے ضروری اقدامات کرنا واجب ہے، اور چوں کہ شعائر دینیہ اور مقدسات اسلامیہ کی تعظیم

اوران کے بارے میں کسی کی طرف سے بھی گستاخی، یااہانت ناقابل برداشت ہے؛اس لئے اکیڈمی نے درج ذیل بیان جاری کیا ہے :

ہر زمانہ میں ہر علاقہ کے تمام علماء کا اس پر اجماع رہا ہے کہ جوشخص ذات باری عز اسمہ کی جناب میں، یارسول پاک ﷺ کی ذات رسالت مآب میں، یا کتاب اللہ کے بارے میں استہزاء سے پیش آئے، یا دین اسلام میں جواُمورضروری طور پر ثابت ہیں، ان کا مذاق اُڑائے، تو وہ شخص کافراورمرتد ہے، اورقول یافعل یاتحریر کے ذریعہ اس قسم کی کسی بھی حرکت سے بچنا بہت ضروری ہے؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب سے بچ سکے، اوراسلام کے دائرہ سے خارج نہ ہوجائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ، لاَ تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِن نَّعْفُ عَن طَآئِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۔ (التوبۃ:۶۵-۶۶)

اگرآپ ان سے پوچھئے تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض مشغلہ اورخوش طبعی کررہے تھے، آپ (ان سے) کہہ دیجئے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ، اوراس کی آیتوں کے ساتھ اوراس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے؟ تم اب یہ (بے ہودہ) عذرمت کرو، تم تو اپنے کومومن کہہ کر کفر کرنے لگے، اگر ہم تم سے بعض کو چھوڑ بھی دیں، تاہم بعض کو تو ضرور ہی سزا دیں گے، اس سبب سے کہ وہ (علم ازلی) میں مجرم تھے۔

اورارشاد ہے :

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَاباً مُّهِيناً ۔ (الاحزاب:۵۷)

بے شک جولوگ اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کوایذاء دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اورآخرت میں لعنت کرتا ہے، اوران کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کررکھا ہے۔

اورارشاد ہے :

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (التوبۃ:۶۱)

اور جولوگ رسول اللہ کوایذائیں پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دردناک سزا ہوگی۔

اورصحیح مسلم کی حدیث میں ہے، حضرت عباس بن عبدالمطلب روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :

ذاق طعم الإیمان من رضی با للہ ربا ، وبالإسلام دینا ، وبمحمد رسولا ۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۳۴)

اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جس نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے کو دل سے تسلیم کرلیا۔

نیز اُمت اسلامیہ مرحومہ کی ذہنی، تہذیبی اور معاشرتی یکسانیت ووحدت بھی اللہ تعالیٰ کو رب، اسلام کو دین، اور محمد (ﷺ) کو نبی ورسول ماننے پر قائم ہے، ارشاد خداوندی ہے :

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَلاَ تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ إِذْ کُنتُمْ أَعْدَاء فَأَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہِ إِخْوَاناً وَکُنتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَکُم مِّنْہَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ آیَاتِہِ لَعَلَّکُمْ تَہْتَدُوْنَ ، وَلْتَکُنْ مِّنکُمْ أُمَّۃٌ یَدْعُوْنَ إِلَی الْخَیْرِ وَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنکَرِ وَأُوْلٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْن ۔ (آل عمران:۱۰۳-۱۰۴)

اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ (تم سب) باہم متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو، اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں اُلفت ڈال دی، سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے، اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، سو اس سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کرکے بتلاتے رہتے ہیں؛ تاکہ تم لوگ راہ پر رہو اور تم میں ایک ایسی جماعت ضروری ہے جو خیر کی طرف بلایا کرے، نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے، اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

ہر مسلمان کے نزدیک ان مقدسات کی تعظیم وتکریم مسلَّم ہے، اس بارے میں کسی بھی قسم کی گستاخی اور اہانت نا قابل برداشت ہے۔

اور اُمت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اس انعام واکرام کو اپنے سامنے رکھے جو خیر اُمت بنا کر اللہ تعالیٰ نے اس پر کیا ہے، ارشاد باری ہے: ''کُنتُمْ خَیْرَ أُمَّۃٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' (آل عمران:۱۱۰) ''تم بہترین اُمت ہو، تم کو لوگوں کے فائدہ کے لئے نکالا گیا ہے'' اور اللہ تعالیٰ نے اس کو آخری اُمت بنایا ہے، تمام ادیان سے عمدہ اور آخری دین ان کو عطا کیا ہے، خاتم النبیین اور سید المرسلین کی اُمت بنایا ہے اور اس بات کو یاد رکھے کہ اس کا شیرازہ منتشر تھا،

ان کو دنیا میں کمزور سمجھ لیا گیا تھا، اللہ رب العزت نے دین اسلام داخل ہونے اور اس میں پختگی کے ذریعہ ان کی اصلاح کی :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ، وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنكُمْ خَآصَّةً وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ، وَاذْكُرُوْا إِذْ أَنتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِيْ الْأَرْضِ تَخَافُوْنَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ، يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَخُوْنُوْا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُوْنَ ، وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللّٰهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔ (الانفال: ۲۴-۲۸)

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالایا کرو، جب کہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہیں، اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں، اور بلا شبہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے اور تم ایسے وبال سے بچو، کہ جو خاص ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم قلیل تھے، زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے اور اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ (مخالف) لوگ تم کو نوچ کھسوٹ نہ لیں، سو (ایسی حالت میں) اللہ نے تم کو (مدینہ میں) رہنے کی جگہ دی، تم کو اپنی نصرت سے قوت دی، اور تم کو نفیس نفیس چیزیں (کھانے کو) عطا فرمائیں؛ تاکہ تم شکر کرو، اے ایمان والو! تم لوگ اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو، اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں بھی خلل مت ڈالو اور تم تو اس کا مضر ہونا جانتے ہو، اور تم (اس بات کو) جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے امتحان کی چیز ہے اور (اس بات کو بھی جان رکھو کہ) اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا بھاری اجر (موجود) ہے۔

نبی ﷺ کی تعظیم وتوقیر اور اُمت پر آپ کے جو حقوق ہیں، ان کا دھیان رکھنا، آپ ﷺ کی سیرت وشمائل، اور اخلاق وعادات کی نشر واشاعت سب سے بڑی ذمہ داریوں میں سے ہے؛ ارشاد باری ہے :

إِنَّـا أَرْسَـلْنَاکَ شَاهِداً وَّمُبَشِّراً وَّنَذِيْراً ، لِتُؤْمِنُوْا بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُکْرَةً وَّأَصِيْلاً ۔ (الفتح:۸-۹)

ہم نے آپ کو گوہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے؛ تا کہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس کی مدد کرو، اور اس کی تعظیم کرو، اور صبح وشام اس کی تسبیح میں لگے رہو۔

اور ارشاد ہے :

ذٰلِکَ وَمَن يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِندَ رَبِّهٖ وَأُحِلَّتْ لَکُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْکُمْ فَاجْتَنِبُوْا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۔ (الحج:۳۰)

یہ بات تو ہو چکی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے محترم احکام کی وقعت کریگا، سو یہ (وقعت کرنا) اس کے حق میں اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے، اور ان مخصوص چوپایوں کو، باستثناان بعض کے جو تم کو پڑھ کر سنادئے گئے ہیں، تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے، تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے (بالکل کنارہ) کش رہو، اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو۔

چنانچہ اسلامی فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں درج ذیل اُمور کی اہمیت پر زور دیتی ہے :

(۱) اُمتِ محمد یہ اور دین اسلام کے لئے اخلاص رکھنے والے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ نئی نسل کو حقائق ایمانی سے روشناس کرانے ، شعائر اسلام کی تعظیم وتکریم ، ہدایت ونیکی ، اللہ اور رسول سے محبت واُلفت پر ان کی تربیت کرنے میں بھر پور حصہ لے، ملت کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں میں ان جذبات کو پیوست کرے؛ تا کہ ان کے برتاؤ میں دینی تربیت کے اثرات اور اسلامی قدریں نمایاں ہوں ، یہ ذمہ داری سب سے زیادہ خدا ترس علماء پر عائد ہوتی ہے، نیز والدین ، خاندان ، اساتذہ ، تربیت کنندگان اور اولیا وسرپرستوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ کار میں اس کا ذمہ دار ہے ، جیسے جیسے تہذیبیں گمراہی کا شکار ہوتی جارہی ہیں ، اسی لحاظ سے ذمہ داریاں بھی بڑھتی جارہی ہیں ، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تمام جہتوں کامل کر کام کرنا ضروری ہے؛ تا کہ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان پر عمل آوری ممکن ہو، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا :

کلکم راع ، وکلکم مسوؤل عن رعيته ، الإمام راع ومسوؤل عن رعيته ، والرجل راع فی أهله وهو مسوؤل عن رعيته ، والمرأة راعية فی بيت زوجها ومسوؤل عن رعيتها ۔

(صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۸۹۳، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۲۹، عن ابن عمرؓ)

تم میں سے ہر فرد ذمہ دار ہے، اور اس سے اس کی رعیت کی پوچھ ہوگی، مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اور اس سے اس کی رعیت کی پوچھ ہوگی، عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے، اور اس سے اس کی ذمہ داری کی پوچھ ہوگی؛ لہٰذا تم میں سے ہر فرد ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں پوچھ ہوگی۔

(۲) نرم گفتار اور خوشگوار طرز عمل کے ذریعہ ہر سطح پر نئی نسل اور علما امت کے درمیان رابطہ استوار کرنا، دعوت وارشاد کے میدان میں نئی نسل کو مخاطب کرنے کے لئے جدید تر اُسلوب اختیار کرنا، نئی نسل کی فکر اور ان کی مشکلات کو سمجھنا، ان کی ذہنی، نفسیاتی اور روحانی اُلجھنوں کو سننا اور مناسب حل پیش کرنا، شکوک وشبہات کو دور کرنے میں ان کا ساتھ دینا، دین متین سے ان کی محبت میں اضافہ کرنا، ثقافتی سرگرمیوں، میٹنگوں، انجمنوں اور دیگر سرگرمیوں میں حصہ لے کر بلند پایہ علمی وفکری مباحث میں ان کو شریک کرنا، سنجیدہ مذاکرات اور صبر جمیل، خوش خلقی وملنساری سے فاصلوں کو پاٹنا، یہ وہ عظیم ذمہ داریاں ہیں، جن کو ادا کرنے کی قدرت وصلاحیت خوف خدا اور فکر آخرت رکھنے والے علما ہی سب سے زیادہ رکھتے ہیں۔

(۳) ہر وہ فرد جس نے صراط مستقیم کو ترک کیا، اور گمراہی کا راستہ اختیار کیا، فکری انحراف کا شکار ہو کر خواہش نفس اور شیطان کی پیروی کی، اور شکوک وشبہات میں مبتلا ہو چکا، اس کو چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رُجوع کرے، توبہ وانابت کا راستہ اختیار کرے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

وَتُوبُوا إِلَى اللهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ (النور:۳۱)

اے مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو؛ تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اور اس پر لازم ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو تھام کر صراط مستقیم کی پیروی کرنے والا بن جائے؛ ارشاد باری ہے :

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۔ (الانعام:۱۵۳)

اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ (وہ راہیں) تم اس کی (یعنی اللہ کی) راہ سے جدا کردیں گی۔

نیز ارشاد ہے :

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔ (صٓ:۲۶)

اور نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا (اگر ایسا کروگے تو) وہ خدا کے راستہ سے تم کو

بھٹکا دے گی (اور) جولوگ خدا کے راستہ سے بھٹکتے ہیں، ان کے لئے سخت عذاب ہوگا؛ اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔

(۴) اکیڈمی اسلامی حکومتوں کو دعوت دیتی ہے کہ الحاد و بد دینی کے محرکات کو روکنے، اس کے وسائل پر بندش لگانے، اُمت میں اس کی افزائش کے ذرائع کو ختم کرنے اور بد دینی پر مبنی چینلوں اور دوسرے وسائل پر بند لگانے اور نئی نسل کو اپنا مخاطب بنانے اور مختلف طریقوں پر ان کو متوجہ کرنے میں اپنا کردار ادا کریں؛ تا کہ دین اور شعائر دین کی حفاظت ہو، مسلم معاشرے کی بنیادیں مضبوط ہوں، اور یہ حکومتیں اس آیت کی مصداق بنیں :

الَّـذِيـنَ إِن مَّـكَّـنَّـاهُـمْ فِـيْ الْأَرْضِ أَقَـامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وللهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۔ (الحج:۴۱)

یہ لوگ ایسے ہی کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکا دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں، اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

(۵) شرعی عدالتوں کی اہمیت اور قوت میں اضافہ کریں، دین اسلام کے بارے میں حد سے تجاوز کر کے اس کی قدروں کو پامال، مقدسات کی عظمت کو مشکوک، اور اُمت کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے افراد اور مشتبہ اداروں کی باز پرس کے معاملات کو شرعی عدالتوں کے سپرد کریں اور ان کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ قوم وملت کے خلاف ان کے جرائم وفساد کے لحاظ سے ان کا محاسبہ کریں۔

(۶) مختلف اسلامی ممالک میں وزارت برائے اعلیٰ تعلیم، اور دیگر متعینہ محکموں سے اکیڈمی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اسلامی معاہد اور شرعی کالجس کے قیام کے دائرے کو مزید وسعت دیں، اور جو ادارے قائم ہیں ان کی امداد اور استحکام میں مزید تعاون کریں؛ تا کہ فن میں اختصاص رکھنے والے خدا ترس علما تیار ہوں، جو شریعت الٰہی کا علم رکھتے ہوں، اور اس کے مطابق عوام کی بہتر تربیت پر قادر ہوں۔

(۷) اکیڈمی ذرائع ابلاغ، فکری اور ثقافتی ویب سائٹس سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کریں اور اسلامی معاشروں میں الحاد وتشکیک پیدا کرنے والے اسباب اور مقدسات دین کی اہانت اور الحاد وتشکیک پھیلانے والے وسائل پر بندش لگانے میں سرگرم ہوں اور اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کریں۔

(۸) اسلامی اداروں اور عالمی تنظیموں کے تعاون سے رابطہ عالم اسلامی ایک ایسا قانون صادر کروانے کی کوشش اور فکر کرے، جو مذہبی مقدسات پر زبان درازی، گستاخی اور حد سے تجاوز کرنے کو جرم قرار دے۔

(۹) رابطہ عالم اسلامی کی اسلامی فقہ اکیڈمی اس صورتحال اوراس کے اسباب کا مطالعہ کرنے اوراس کے ازالہ کے طریقے تلاش کرنے کی غرض سے ایک کانفرنس کا جلداز جلد انعقاد عمل میں لائے، جس میں ان امور کی فکر کرنے والوں کواور ماہرین کودعوت دی جائے، اوراس میں متخصص اداروں کی بھی شرکت ہو۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہم کو کماحقہ اپنی عبادت، تعظیم وتوقیر، اوررسول اکرم ﷺ کے ساتھ اکرام واحترام کا معاملہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اوراحکام شریعت کا ادب کرنے والا بنائیں، قرآن میں ہے :

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهُ مَكْتُوْباً عِندَهُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِهِ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوْا النُّوْرَ الَّذِيَ أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (الاعراف:۱۵۷)

جولوگ ایسے رسول نبی اُمی کا اتباع کرتے ہیں، جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے) کہ وہ ان کو نیک باتون کا حکم دیتے ہیں، اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کوان کے لئے حلال بتلاتے ہیں، اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پرحرام فرماتے ہیں، اوران لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں، سو جولوگ ان (ان نبی موصوف) پرایمان لاتے ہیں، اوران کی حمایت کرتے ہیں، اوران کی مدد کرتے ہیں، اوراس نور کا اتباع کرتے ہیں جوان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اور یہ بھی دعا ہے کہ اللہ رب العزت دین متین کو سربلندی عطا فرمائے، اورتمام ادیان پراس کوغلبہ نصیب فرمائے، اوراپنے مومن بندوں کی نصرت فرمائے۔آمین

مسلم خاندان اور دورِ جدید کے چیلنجز

سوسائٹی کی تعمیر میں خاندان بنیادی کردارادا کرتا ہے، اللہ عز وجل نے انسان کورشتہ کا بندھن عطا کرکے انعام فرمایا ہے، ارشاد باری عزاسمہ ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاءً وَاتَّقُوْا اللهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهِ

وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا، اور اس جاندار سے اس کا جوڑ پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں، اور تم خدا تعالی سے ڈرو، جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

اور ارشاد ہے:

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُم مِّنْ أَنفُسِکُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَکُم مِّنْ أَزْوَاجِکُم بَنِیْنَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبَاتِ أَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰہِ ھُمْ یَکْفُرُوْنَ ۔ (النحل:۷۲)

اور اللہ تعالی نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائیں، اور تمہاری بیویوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے، اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں، کیا پھر بھی (یہ لوگ) بے بنیاد چیز پر ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے رہیں گے؟

نیز ارشاد ہے:

وَمِنْ آیَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَکُم مِّنْ أَنفُسِکُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْکُنُوْا إِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَآیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَتَفَکَّرُوْنَ ۔ (الروم:۲۱)

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں، تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے، اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

ان آیات میں خاندانی نظام کو تقویت دینے والے جن عناصر کا تذکرہ ہے، یعنی: چین وسکون، اُلفت ومحبت، ہمدردی ورحم دلی، رشتۂ فرزندی، نسبی وسسرالی قرابت داری، یہ خاندانی نظام کو باہم مربوط کرتے ہیں اور اس کے تانے بانے کو کمزوریوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور چوں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اعلیٰ اخلاق واقدار پر مبنی ایک خاندانی نظام عطا فرما کر احسان کیا ہے؛ اس لئے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی حفاظت وصیانت کریں، اس کی جڑوں کو مضبوط کریں، اس کی شاخوں کی دیکھ ریکھ کریں، اور پوری دنیا کو اس کے ثمرات سے روشناس کرائیں جو سکون وطمانینت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

مسلم خاندان جو شریعت کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اپنی ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اس کو آج ایسے چیلنجز درپیش ہیں، جو اس کے تانے بانے کو متاثر کررہے ہیں، اس کے پیام انسانیت کو دوسروں تک پہنچانے میں رکاوٹ بن رہے ہیں اور اس کے نظام میں ایسے مظاہر روز افزوں ہیں جو اپنے اندر خطرناک اور نقصاندہ اثرات لئے ہوئے ہیں، اور ان کا فوری علاج ناگزیر ہے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کے بیسویں اجلاس منعقدہ: ۱۹-۲۳ رمحرم ۱۴۳۲ھ، مطابق ۲۵-۲۹ دسمبر ۲۰۱۳ء کی پانچویں قرارداد کے موافق مسلم خاندان اور دور جدید کے چیلنجز کے عنوان پر رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت اسلامی فقہ اکیڈمی نے مکہ مکرمہ میں ۲۵-۲۶ رمحرم ۱۴۳۲ھ کو سیمینار منعقد کیا۔

اس سیمینار میں علما دین کی ایک منتخب جماعت کے ذریعہ تیار کئے گئے مقالات پیش کئے گئے، جن میں مقالہ نگاروں کی جانب سے متعدد منفی مظاہر، اور مسلم خاندان پر مرتب ہونے والے ان کے نتائج کو زیر بحث لایا گیا ہے، ان میں سے بعض منفی حالات یہ ہیں :

(الف) نکاح سے اعراض اور بے رغبتی۔

(ب) ناجائز جنسی تعلقات میں اضافہ۔

(ج) مجہول النسب افراد کی کثرت۔

مقالات کو پیش کرنے اور سیمینار میں شرکت کرنے والے اصحاب علم وفضل کے مناقشات کی سماعت کے بعد درج ذیل تجویز منظور کی گئی :

(۱) نئی نسل میں دین کی قدروں کو راسخ کرنے کی فکر کرنا اور خود احتسابی پیدا کرنا چاہئے، جو کہ دونوں صنفوں (مردوں رعورتوں) کے اندر خود اپنی نگرانی کے جذبہ کو پیدا کرتا اور اس کو بڑھاوا دیتا ہے، اور یہی نگرانی فواحش ومنکرات سے دور رہنے میں سب سے زیادہ مدد ومعاون ہوتی ہے۔

(۲) خاندان اور معاشرے کے اندر اخلاقی ضابطوں اور معاشرتی قدروں کو فروغ دینا چاہئے۔

(۳) سوسائٹی کو اور خصوصا نوجوانوں کو جلد نکاح کرنے کی اہمیت اور اس کو فوائد سے مطلع کرنا، اور شریعت اسلامی میں اس کے جو عظیم مقاصد ہیں اس کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔

(۴) خاندانی فرائض وحقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ان کا محاسبہ، اور شریعت میں بے حیائی اور فواحش پر روک لگانے کے لئے جو حدود اور تعزیرات مقرر کی گئی ہیں، ان پر عمل درآمد ہونا چاہئے۔

(۵) منکرات میں مبتلا کرنے والے راستوں پر قدغن لگانا بہت اہمیت کا حامل ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے :

وَلاَ تَقْرَبُوْا الزِّنَی إِنَّهُ کَانَ فَاحِشَةً وَسَاء سَبِیْلاً ۔ (الاسراء:۳۲)

اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو، بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور برا راستہ ہے۔

کیوں کہ ناجائز جنسی تعلقات سے پہلے عام طور سے کئی قدم اٹھ چکے ہوتے ہیں، مثلا: مرد وعورت کا بے قید میل جول، ذرائع ابلاغ کی ناجائز جنسی تعلقات کی طرف ڈھکی چھپی ترغیب، اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے مناظر کی اشاعت وغیرہ، جس سے ناجائز تعلقات کی راہ ہموار ہوتی ہے، اور معاملہ حد سے بڑھ کر جاتا ہے، یہ صورتحال اس کی متقاضی ہے کہ عالم اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو زندہ کیا جائے اور اسلامی ممالک صحیح سمت پر گامزن اسلامی بیداری کی طرف متوجہ ہوں، جس سے باری تعالی کے اس فرمان پر عمل ہو سکے :

وَلْتَکُن مِّنکُمْ أُمَّةٌ یَدْعُوْنَ إِلَی الْخَیْرِ وَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنکَرِ وَأُوْلَـئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (آل عمران:۱۰۴)

اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضرور ہے، جو کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

اور اس فرمانِ الٰہی پر بھی عمل درآمد ہو :

کُنتُمْ خَیْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِا للهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْکِتَابِ لَکَانَ خَیْراً لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَأَکْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۔ (آل عمران:۱۱۰)

تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے، تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ تعالی پر ایمان لاتے ہو، اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا، ان میں بعضے تو مسلمان ہیں، اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہے۔

سیمینار کے مشارکین اس ضمن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں مملکت سعودی عربیہ کی کوششوں کی ستائش کرتے ہیں۔

(۶) خاندانی نظام کو انتہائی اہمیت حاصل ہے، اور کئی چیلنجوں کو اس کو سامنا ہے، جو اپنے تنوع اور کثرت کی وجہ سے اس کے متقاضی ہیں کہ باریک بینی سے جائزہ لے کر ان پر تحقیق کی جائے، اور مسلم سماج کے احوال کا

احاطہ کیا جائے ،اس بنا پر سیمینار رابطہ عالم اسلامی سے سفارش کرتا ہے کہ رابطہ ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقادعمل میں لائے ، جواس مسئلہ پر توجہ دے، کانفرنس کے لئے علما کی ایک ٹیم تشکیل دی جائے جوموضوعات متعین کرے، اور مسلم خاندان کو درپیش چیلنجوں کا احاطہ کرے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی ان سفارشات کی تائید کرتی ہے،اور رابطہ سے اس کی اُمید کرتی ہے کہ وہ عالم اسلام میں اور مسلم اقلیت معاشرہ میں قومی اور سرکاری سطح پر خاندان کے اُمور سے متعلق بااختیار اداروں سے ان سفارشات کے سلسلہ میں رابطہ میں رہے گی۔

وصلی اللہ علٰی سیدنا محمد وعلٰی آلہ وصحبہ جمعین ۔

○ ○ ○

اسلامی اخلاقیات کے سماجی مفاہیم — راہِ عمل کا ایک مطالعہ

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن ●

ہندوستان کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ منصف حیدرآباد اور انقلاب ممبئ میں مولانا رحمانی ہفتہ وار کالم ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے لکھتے ہیں، جس میں عصر حاضر کے سماجی و انسانی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور فکر و عمل ہر دو جہت سے اُمت کی رہنمائی کی جاتی ہے، ان مضامین کی اب تک ۹ر جلدیں آچکی ہیں، جن میں پانچ ''راہ عمل'' کے عنوان سے ہیں، چار ''شمع فروزاں'' کے نام سے راہ عمل کی ان جلدوں کو پڑوسی ملک پاکستان سے زمزم بک ڈپو کراچی نے شائع کیا، اس کا ایک تفصیلی تعارف پاکستان کے ایک مقبول ماہنامہ ''الشریعہ'' میں شائع ہوا، اس تبصرہ میں تحسین بھی ہے اور تنقیح بھی اور تبصرہ نگار نے ان مضامین سے جو باتیں اخذ کی ہیں، ان میں بعض قابل قبول بھی ہیں اور بعض نا قابل قبول تاہم اس نقطۂ نظر سے اس تبصرہ کو شائع کیا جا رہا ہے کہ پڑوسی ملک میں دانشوروں کا طبقہ ملی مسائل کے بارے میں کس انداز پر سوچتا ہے، اس تحریر سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (سید عبدالرشید)

خالد سیف اللہ رحمانی، ہندوستان کے معروف عالم دین ہیں، ان کے مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کے مجموعے عوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں، اب ان مجموعوں کا مجموعہ پاکستان میں زم زم پبلشرز کراچی نے ''راہِ عمل'' کے عنوان سے شائع کیا ہے، راہِ عمل دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کے پانچ حصے ہیں، جلد اول میں تین اور جلد دوم میں دو حصے ہیں، ان حصوں کے عنوانات بالترتیب (۱) نقوشِ موعظت، کل صفحات: ۳۶۶ (۲) حقائق اور غلط فہمیاں، کل صفحات: ۲۱۲ (۳) نئے مسائل - اسلامی نقطۂ نظر، کل صفحات: ۲۷۰ (۴) عصر حاضر کے سماجی مسائل، کل صفحات: ۲۲۴ (۵) دینی و عصری تعلیم - مسائل اور حل، کل صفحات ۲۶۰ ہیں، یوں ''راہِ عمل'' کی دو جلدوں اور پانچ حصوں کے مجموعی صفحات: ۱۳۳۲ ہیں۔

● شعبۂ سیاسیات: گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ، پاکستان۔

اس تالیف کے عنوان اور مؤلف کے نام کے ساتھ ’مولانا‘ کے سابقے سے ہماری یہ گھڑی گھڑائی رائے تھی کہ کاغذ قلم جیسے انتہائی اہم وسائل اور قارئین کے قیمتی اوقات کے ضیاع کی خاطر، روایتی طرز کے مباحث مولویانہ اُسلوب میں بیان کئے گئے ہوں گے؛ لیکن ’راہِ عمل‘ کی ورق گردانی نے خوش گوار حیرت سے دوچار کر دیا کہ طبقہ علماء میں اپنے زمانے اپنے معاشرے سے جڑے ہوئے خالد سیف اللہ رحمانی جیسے صاحبِ نظر جہاں دیدہ افراد بھی پائے جاتے ہیں جو زندہ معاشرتی موضوعات پر نہ صرف سوچنے کی جرأت کر سکتے ہیں؛ بلکہ اپنی سوچ کو انتہائی دلکش ادبی اُسلوب میں الفاظ کا جامہ پہنانے پر بھی قادر ہیں، اس لئے کم از کم علماء کو تو ’راہِ عمل‘ کا سنجیدگی سے لازماً مطالعہ کرنا چاہئے؛ تاکہ انھیں معاصر مسائل سے کماحقہٗ آگاہی حاصل ہو سکے، اگرچہ بحیثیت مجموعی اس تالیف کے مخاطب عوام الناس ہیں۔

خالد سیف اللہ رحمانی نے قلم اُٹھاتے ہوئے، وقت کی نزاکت، قلم کی حرمت اور اپنے مقام (بطور عالم دین) کا بہت دھیان رکھا ہے، اس لئے ’راہِ عمل‘ کا تنقیدی مطالعہ قاری پر یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ خالد صاحب بہت سنبھل کر اور نہایت محتاط انداز میں اپنا مافی الضمیر اس ڈھنگ سے بیان کرنے کے خوگر ہیں کہ ابلاغ بھی ہو جائے اور کتمانِ حق کی تہمت بھی ان کے دامن کو تر نہ کر سکے، ان کے اس اُسلوب کی شہادت زیر نظر تالیف کے ایسے سینکڑوں صفحات بابانگِ دُہل دے رہے ہیں، جن میں مؤلف محترم نے ہندوستان جیسی کثیر مذہبی، کثیر لسانی، کثیر ثقافتی، کثیر نسلی ریاست میں جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت میں جی رہے ہیں، مسلم شناخت کی بازیافت کی صدا اس سلیقے سے لگائی ہے کہ نہ صرف ان کے غیر مسلم ہم وطنوں کی کوئی دُکھتی رگ نہ چھڑے؛ بلکہ ممکن حد تک وہ اس صدا کی سلیقگی پر ریجھ بھی سکیں۔

’’راہِ عمل‘‘ کے مضامین اخباری ہوتے ہوئے بھی اخباری نہیں ہیں، مؤلف محترم نے دعوت وابلاغ کے لئے پلیٹ فارم کے انتخابات میں زمینی حقائق کو پیش نظر رکھا ہے؛ لیکن طرزِ تحریر اور اُسلوب بیان میں صحافتی سطح سے بہت بلند ہو کر تحقیقی، علمی، تنقیدی، تقابلی، تنقیحی اور توضیحی اُسلوب دیدہ ودانستہ اپنایا ہے اور خوب نبھایا ہے، ہمارے بیان کو مبالغہ آرائی پر محمول خیال نہ کیا جائے؛ کیوں کہ زیر نظر تالیف کے مضامین میں بیسیوں کتب کے حوالے، قرآن مجید اور احادیث نبوی کا استناد کے ساتھ بیان اور ان سے استدلال کے جاں فزا نمونے ہماری رائے کی ثقاہت کا منھ بولتا ثبوت ہیں، اگرچہ بعض مقامات پر موضوع کی حساسیت نے خالد صاحب کو جذباتی اظہار پر مائل کیا ہے؛ لیکن ان کے قلم کی جولانی کہیں بھی ایسی متلاطم دھارا کا روپ نہیں دھار سکی جو ان کی فکری لگام سے مکمل آزاد اور بے نیاز ہو سکے؛ لہٰذا آج کے انتہائی پر آشوب ماحول کی مناسبت سے مؤلف محترم کے اُسلوب کو بلا خوفِ تردید ’’ذمہ دارانہ‘‘ قرار دیا جا سکتا ہے۔

زبان ومحاورے پر گرفت کے باوجود ہمارے ممدوح کہیں کہیں تسامح کے مرتکب ہوئے ہیں، اگر ایسا کسی

نام نہاد ترقی پسند ادیب سے سرزد ہوا ہوتا تو شاید ہم گرفت نہ کرتے؛ لیکن خالد سیف اللہ صاحب رحمانی اپنی تحریر کے بین السطور جس فکری بلندی پر متمکن نظر آتے ہیں، اس سے ہمیں ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ بعض محاوروں میں مستور اس 'تحقیر' سے آگاہ نہ ہوں گے جو اپنی اصل میں ہمارے زوال کی زندہ علامت ہے اور اقوامِ عالم میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص، ہر اعتبار سے ہماری ذہنی خجالت کی نمائندگی بھی کرتی ہے، مثلاً ''گداگری اور اس کا سدِ باب'' کے زیر عنوان خالد صاحب رقم طراز ہیں :

کچھ فرزانے ایسے بھی ہیں جو آپ کو دو چار صلواتیں سنانے سے بھی نہیں چوکتے، وہ اس طرح سوال کرتے ہیں کہ ناواقف آپ کو ان کا مقروض سمجھ بیٹھے۔ (ج:۲، ح:۴، ص:۱۱۲)

ظاہری اعتبار سے یہ فقرہ بہت زبردست ہے، چست، تیکھا، تیر بہدف، اس فقرے کا دوسرا حصہ: ''وہ اس طرح سوال کرتے ہیں کہ ناواقف آپ کو ان کا مقروض سمجھ بیٹھے'' خالد صاحب کی ایسی ظرافت کا غماز ہے جس کے پیچھے انتہائی سنجیدہ مشاہداتی مزاج پوشیدہ ہے؛ لیکن اس فقرے کا پہلا حصہ جس میں 'صلواتیں سنانے' کا ذکر کیا گیا ہے، محاورۃً ہمارے تہذیبی زوال کا تراشیدہ تو ہے ہی اس کا مسلم لکھاریوں کے ہاں برتا جانا ایسی پس ماندہ نفسیات کا آئینہ دار ہے جس کے بعد ذہنی خود کفالت کی بابت سوچنا بھی محال ہے، ہمارے دین میں صلوٰۃ کا جو مقام ہے، خالد سیف اللہ صاحب ہم سے بہتر جانتے ہیں، اسی لئے ان کا اس محاورے کو اپنے احاطہ تحریر میں لانا ہمیں چبھ گیا ہے، حیرت کی بات ہے کہ ایک مقام پر خود لکھتے ہیں کہ :

کسی بھی زبان میں ایک لفظ کا جو حقیقی معنی ہوتا ہے، وہ براہ راست اور بالواسطہ مناسبتوں کی وجہ سے نئے نئے پیکر میں ڈھلتا رہتا ہے۔ (ج:۱، ح:۲، ص:۹۴)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالد صاحب کی تنقیدی نظر سے زبان و بیان کے اطراف واکناف کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں، لفظ کا اپنی اصل کی مناسبت سے نئے نئے پیکروں میں ڈھلنا بتا رہا ہے کہ ان کی نگاہِ ناز الفاظ کی ساخت و ماہیت کے اسرار و رموز پر بھی ہے، جبھی تو یوں رقم طراز ہیں :

شعراء اور نئی روشنی کے لوگ تو ان کی تحقیر سے بھی نہیں چوکتے تھے اور ان کو ''تنگ نظر ملا'' اور ''دو رکعت کا امام'' جیسے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ (ج:۲، ح:۵، ص:۴۴)

اسے ستم ظریفی ہی کہئے کہ اس کے باوجود نادانستگی میں سہی؛ لیکن اسی تحقیر کے بقلم خود مرتکب ہوئے ہیں اور تحقیر بھی کسی فرد یا طبقے کی نہیں؛ بلکہ دین اسلام کے ایک بنیادی رکن کی، اس واحد تسامح کے علاوہ اور کہیں ان سے زبان و بیان کی حد تک غالباً چوک نہیں ہوئی؛ بلکہ جا بجا ایسے دلکش فقرے بکھرے ہوئے ہیں کہ قاری نہ صرف حقیقت آفرینی کا لطف اُٹھاتا ہے؛ بلکہ زبان کا چٹخارہ بھی لیتا ہے، مثلاً :

فرقہ بندیوں اور باہمی عداوتوں نے ہمیں سمندر کی سی طاقت رکھنے کے باوجود قطروں میں تقسیم کردیا ہے، ایسا قطرہ جسے دھوپ کی ہلکی سی تمازت اور ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی وجود سے محروم کرسکتا ہے۔(ج:۱، ح:۱،ص:۴۷۱)

قومی یکجہتی نفرت کا پتھر پھینک کر حاصل نہیں کی جاسکتی، اس کے لئے محبت اور پیار کے پھول برسانے ہوں گے۔(ج:۲، ح:۴،ص:۷۰)

جس سفینہ کا ناخدا ہی آدابِ سفر سے بے بہرہ ہو، کون ہے جو اسے ساحل سے ہمکنار کرے؟(ج:۲، ح:۴،ص:۱۵۶)

یلغار کے مظالم یا افغانستان کی جنگ سے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں کئے جاسکتے اور نہ ان کے ایمان کا سودا کیا جاسکتا ہے، یہ وہ نشہ ہے کہ جس قدر اُتارنے کی کوشش کی جائے، اسی قدر چڑھتا ہے، یہ وہ پودا ہے جس قدر تراشا جاتا ہے، اسی قدر سربلند اور سایہ دار ہوتا جاتا ہے۔(ج:۱، ح:۱،ص:۲۵۸)

یہ عجیب بات ہے کہ یہ ملک جس کو مسلمانوں نے وسعت و وحدت عطا کی، معاشی فراخی دی، امن و امان دیا، عدل و مساوات سے آشنا کیا، سماجی انصاف کی دولت دی، اس کے چپہ چپہ پر تاریخی عظمت کے نقوش سجائے اور اسی زمین کو اپنا مسکن اور مدفن بنایا، ان کی قربانیوں کو وہ لوگ مسخ کرنا چاہتے ہیں، جن کے تلووں میں اس ملک کے بنانے، سنوارنے اور بچانے میں شاید ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو۔(ج:۱، ح:۱،ص:۲۸۶)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تحریر شخصیت کی عکاسی کرتی ہے اور اہل نظر کہتے ہیں کہ کسی شخص کی اصلیت دیکھنی ہو تو اسے غم وغصہ کی حالت میں دیکھو، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے محترم کی جمالیاتی حس غم وغصہ میں بطورِ خاص بیدار ہوجاتی ہے، اسی لئے ان کے مزاج میں موجود عمومی شائستگی نے ایک دل خراش واقعہ یوں قلم بند کیا ہے :

آہ اے مظلومانِ گجرات! اور صد آہ، اے ستم زدگانِ دنیائے بےثبات! جو مظالم تم بے گناہوں پر ڈھائے جارہے ہیں؛ کیوں کر ان کا بیان ہو؟ قلم کا جگر شق ہوجائے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، کہ اگر پتھروں کو دیکھنے کی قوت میسر ہوتی تو شاید وہ بھی اس بربریت کو دیکھ کر ریزہ ریزہ ہوجاتے اور سمندر کو رونے والی آنکھیں نصیب ہوتیں تو شاید ان کے بھی سوتے خشک ہوکر رہ جاتے، ایسا جور و جفا جنھیں دیکھ کر درندے بھی شرم سے پانی پانی ہوجائیں اور ایسا ظلم وستم جنھیں سن کر تاریخ کے ستم شعار لوگوں کی روح بھی وجد میں

آ جائے، زبان وقلم کی کیا مجال کہ ان مظالم کے شایانِ شان مرثیہ کہے، ان آنکھوں کے سفید اور ٹھنڈے آنسو اس انسانیت سوزی پر کیا قربان ہوں! اگر قلب وجگر کی آنکھیں ہوتیں اور وہ گرم وحرارت انگیز خون ولہو کے آنسو نچھاور کرسکتیں تو شاید کچھ اس غم کا بیان ہوسکتا...... صد ہزار رحمتیں ہوں تمہاری جان پرسوز اور روح شہادت شعار پر جو جرم بے گناہی کی سزا پا رہے ہیں اور جنھیں صرف اس لئے آتش نمرود میں جھونکے جانے کی سنت ادا کرنی پڑ رہی ہے کہ وہ خوئے آزری کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور دین ابراہیمی کا علم تھامے ہوئے ہیں...... تم پر خدا کی بے پناہ رحمتیں ہوں اور تمہارے لئے خدا کے نام پر مرنا مبارک ہو!! (مردم سوزی-انسانیت سوزی کا بدترین نمونہ، ج:۱، ح:۱ص:۱۹۹)

اس تالیف میں ہمارے محترم نے دینی مدارس کے نظام ونصاب اور طریقۂ تعلیم وغیرہ پر بھی خامہ فرسائی کی ہے، دینی مدارس کی اصلاحِ احوال کا گہرا احساس رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی نظر مدارس سے وابستہ لوگوں کی امتیازی صفات پر بھی ہے، اسی لئے بہت طمطراق سے لکھتے ہیں :

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی ''اُجرت'' کے بجائے ''اجر'' پر نظر رکھنے، تعلیم کو ایک مقدس فریضہ سمجھنے اور طلبہ سے محبت وشفقت کا برتاؤ کرنے کی جو روایت باوجود بہت سارے انحطاط کے ان مدارس میں پائی جاتی ہے، شاید ہی کہیں اور اس کی مثال مل سکے۔ (ج:۲، ح:۵، ص:۱۴۰)

''اُجرت کے بجائے اجر'' میں حرفی تکرار سے قاری کو نعرے کی طرز کی قوتِ محرکہ ملتی محسوس ہوتی ہے، اسے ''اُجرت نہیں، اجر'' کے روپ میں باقاعدہ نعرہ بھی بنایا جاسکتا ہے؛ لیکن کوئی ستم ظریف اسے ''اُجرت نہیں اجر'' کا لبادہ اُوڑھا سکتا ہے، اس لئے ہم نعروں میں خوامخواہ اُلجھنے کی بجائے خالد صاحب کے بیان ''اُجرت کے بجائے اجر'' پر قناعت کرنا پسند کریں گے کہ پہلے نعرے میں مذہب، افیون بنتا نظر آتا ہے اور دوسرے نعرے میں اخلاقیات کا جنازہ نکلتا دکھائی دیتا ہے، بہر حال اسی قبیل کی بحث مؤلف محترم نے ''اپنی عیال کو آگ سے بچایئے'' (ج:۱، ح:۱ص:۱۳۲-۱۳۳) کے عنوان سے کی ہے :

قابل فکر امر یہ ہے کہ آخر علم دین کی طرف سماج کے اونچے طبقے کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ حالاں کہ ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جو بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں تہذیب وشائستگی اور بڑوں کی توقیر، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، اپنے پرائے کے ساتھ حسن سلوک، نگاہ اور زبان کی حفاظت اور اپنے فرائض کے تئیں جواب دہی

کے احساس کا عنصر زیادہ ہوتا ہے؛ لیکن کیا بات ہے کہ اس کے باوجود علم کا یہ شعبہ لوگوں کے التفات سے محروم ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جو لوگ دین اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کے پاس مادی وسائل کم ہیں، ان کو کم تن خواہوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، یہی ایک بات ہے جس نے مادہ پرست اذہان اور حریصانہ فکر و ذہن کے حاملین کو علم دین کی طرف آنے سے روکا ہوا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کیا کھائیں گے؟ اور کیوں کر زندگی گزاریں گے؟ اس سلسلے میں سماج کے لئے دو باتیں قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ کیا مسلمانوں کا معاشرہ اپنے دینی تحفظ کے لئے ایک ایسے طبقہ کی صحیح طریقہ پر کفالت نہیں کر سکتا جس کی تعداد بہ مشکل ایک فی ہزار ہوگی؟ اگر مسلمان اپنی دوسری ضروریات کی طرح دینی خدمت گذاروں کو بھی اپنے لئے ایک ضرورت باور کریں اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کے تعاون کے لئے ہاتھ بڑھائیں اور خادمانِ دین کو کم سے کم۔

معاشی اعتبار سے اس لائق بنائیں کہ وہ متوسط طریقہ پر سماج میں اپنی زندگی بسر کر سکیں تو یقیناً اس علم سے بے اعتنائی اور بے رغبتی کی یہ کیفیت باقی نہیں رہے گی۔

اس اقتباس پر تنقیدی نظر ڈالئے کہ خالد صاحب نے ایک ہی سانس میں کم تن خواہوں کی وجہ سے علم دین کی طرف راغب نہ ہونے والوں کو ''مادہ پرست اذہان اور حریصانہ فکر و ذہن'' کے حاملین قرار دیا ہے اور مسلم سماج کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی ہے کہ وہ خادمین دین کی کم سے کم متوسط طریقہ پر گزر بسر کے لئے اپنا کردار ادا کرے، ہم گزارش کریں گے کہ مذہبی طبقے کی کمزور معاشی حالت کی وجوہات میں سے ایک وجہ دنیا کی مکمل نفی پر مبنی ''مادہ پرست اذہان اور حریصانہ فکر و ذہن'' جیسی طعنہ دینے والی غیر حقیقی سوچ کا معاشرے میں رواج پانا بھی ہے جس کے نتیجے میں، جیسا کہ سطورِ بالا میں اشارتاً ذکر ہوا، مذہب عوام کے لئے واقعتاً افیون بن کر رہ گیا ہے، اسی سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ خالد سیف اللہ صاحب مذہبی طبقے کی متوسط درجے میں کفالت کے خواہش مند ہیں تو کیا یہ حقیقت ان سے ڈھکی چھپی ہے کہ زرعی دور کی فرسودہ دینی تعبیر سے طبقہ علماء جس شدت سے چمٹا ہوا ہے، اسی کے انتہائی تباہ کن اثرات کے بعد مسلم معاشرے کے متوسط طبقے کی اتنی پسلی رہ جاتی ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی طبقہ علماء کو معاشی اعتبار سے اوسط درجے میں لے آئے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ علماء کی فرسودہ دینی تعبیرات سے متاثر یہ طبقہ تو خود اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، یہ نکتہ تو ہمارے محترم پر واضح ہی ہوگا کہ امرا اور جاگیرداروں کو لوٹ کھسوٹ کے نت نئے حربوں کو عملی جامہ پہنانے سے فرصت نہیں ملتی، اس لئے مجموعی طور پر ہمیشہ غریب اور متوسط طبقہ ہی آگے بڑھ

کرکفایت کے درجے میں سہی؛ لیکن حفاظتِ دین میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتا آیا ہے، اسی بحث کے ضمن میں ''مسلم پرسنل لا-ایک غلط فہمی کا ازالہ'' کے زیرعنوان خالد سیف اللہ صاحب کا مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اجمالی طور پر سہی؛ لیکن کم ازکم دینی تعبیر کی ماہیت کی بابت اُصولی بحث تو کی گئی ہے، ملاحظہ کیجئے :

> آپ محسوس کریں گے کہ تغیر پذیر محض اسباب ہیں، انسان کی فطرت اپنی جگہ قائم ہے، وہ جس طرح کل کبھی رنج وغم اور کبھی مسرت وشادمانی محسوس کرتا تھا، آج بھی کرتا ہے، پہلے وہ آہ واہ سے اس کا اظہار کرتا تھا، اب بھی کرتا ہے، کل جس طرح اس کے دل میں اپنے دشمنوں کے خلاف انتقام کا شعلہ سلگتا تھا، آج بھی سلگتا ہے اور جس طرح کل اس کا سینہ مال ودولت اور حرص وہوس کی آماج گاہ تھا، آج بھی اقتصادی ترقی کا بھوت اس کے ہوش وحواس پر سوار ہے، آج بھی اس کا نفس اس کو اخلاقی تقاضوں کے بالائے طاق رکھ دینے کی تلقین کرتا رہتا ہے، جس طرح ماضی کا نقشہ ہمارے سامنے ہے، جس طرح کل جاگیرداری اور زمین داری کی تمنا اس کو بے چین کئے رہتی تھی، آج بھی اس کے دل میں حکومت اور اقتدار کی آرزوئیں چٹکیاں لیتی رہتی ہیں ......اسلام اور اس کے قانونی نظام کا اصل موضوع اسباب ووسائل نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا موضوع انسان اس کی فطرت اور اس کے فطری تقاضوں کی مناسب حدود میں تکمیل ہے، پس جس طرح انسان ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اسی طرح ظاہر ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والا قانون بھی ابدی اور دائمی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود ان نو دریافت وسائل زندگی، بدلتے ہوئے عرف اور زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ میں غیر معمولی تبدیلی ضرور چاہے گی کہ قانون میں اس کی کچھ رعایت کی جائے اور ان تقاضوں اور وسائل سے اسلامی قانون کو ہم آہنگ کیا جائے اور جزوی اور فروعی حدود میں اسلام ان تقاضوں کو قبول کرے، اس سلسلہ میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام نے بعض قانونی اور فکری امتیاز اور بنیادی اُصول کو جوں کا توں باقی رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد میں ضروری تغیر وتبدل اور واقعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے ایسی لچک باقی رکھی ہے جو اس کو فرسودگی سے بچائے رکھے؛ چنانچہ مشہور فقیہ اور مزاجِ شریعت کے رمز شناس حافظ ابن قیمؒ اپنی گراں قدر کتاب ''اعلام الموقعین'' میں اس موضوع پر ایک مستقل باب (جلد دوم میں) قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> عرف وعادت، حالات ومقاصد اور زمان ومکان کے تغیر کی بنا پر مسائل میں اختلاف اور تغیر وتبدل کا بیان، یہ بڑی مفید اور اہم بحث ہے جس سے ناواقفیت کی بنا پر شریعت

میں بڑی غلطیاں واقع ہوئی ہیں ، جس نے دشواری ، تنگی اور استطاعت سے ماورا تکلیف پیدا کردی ہے ، جب کہ یہ بات معلوم ہے کہ شریعت جو مصالح کی غیر معمولی رعایت کرتی ہے ، ان نا قابل برداشت کلفتوں کو گوارا نہیں کرتی ، اس لئے کہ شریعت کی اساس سراپا رحمت اور سراپا مصلحت ہے ؛ لہٰذا جب کوئی حکم عدل کے دائرہ سے نکل کر ظلم وزیادتی ، رحمت کی حدوں سے گزر کر زحمت ، مصلحت کی جگہ خرابی اور کارآمد ہونے کے بجائے بے کار قرار پائے تو وہ شرعی حکم نہیں ہوگا ۔ (ج:۱، ح:۲، ص:۱۴۸-۱۵۰)

حافظ ابن قیمؒ نے کھلے الفاظ میں دینی تعبیرات میں ملحوظ مقصدیت کی صراحت کی ہے اور خود ہمارے ممدوح مؤلف کا رجحان بھی اسی جانب ہے ؛ لیکن اس رجحان پر نفسیاتی تحفظات غالب آتے نظر آتے ہیں ، تغیر وتبدل جیسی حقیقت سے آشنائی کے بعد بھی ان کا یہ کہنا کہ ''اسلام نے بعض قانونی اور فکری امتیاز اور بنیادی اُصول کو جوں کا توں باقی رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد میں ضروری تغیر وتبدل اور واقعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے ایسی لچک باقی رکھی ہے جو اس کو فرسودگی سے بچائے رکھے'' بعض سوالات پیدا کرتا ہے کہ زرعی دور میں تراشے گئے ''بنیادی اُصول'' آخر کیوں کر اتنے بنیادی ہیں کہ فقط ان ہی کے دائرے میں رہتے ہوئے واقعی تقاضوں کی تکمیل کی جائے ؟ اس نظری سوال سے قطع نظر ، کیا واقعی ان کی مدد سے واقعی تقاضوں کی تکمیل (نظری اعتبار سے نہیں بلکہ) عملی طور پر ثمر آور نتائج کے ساتھ ممکن ہے ؟ سوال تو یہ ہے کہ آخر آج کے دور میں قرآن وسنت سے براہ راست ''بنیادی اُصول'' کیوں دریافت نہیں کئے جاسکتے ؟ ہم گزارش کریں گے کہ جس پہلو سے انسان غیر مبتدل حقیقت ہے ، اس پہلو سے اسلامی قانون کی ابدیت صرف اور صرف قرآن وسنت سے مخصوص ہے نہ کہ کسی دور یا کسی امام کے اختراع کردہ بنیادی اُصولوں سے ، چاہے یہ قرآن وسنت سے اخذ شدہ ہی ہوں ، اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اماموں کو شارح کے بجائے شارع تسلیم کرلیا جائے ۔

سطور بالا میں علم دین سے لوگوں کی عدم دلچسپی پر خالد سیف اللہ صاحب کی فکرمندی کا جو جائزہ لیا گیا ہے ، اس کے تناظر میں ہم خود کو یہ رائے دینے کا پابند خیال کرتے ہیں کہ مؤلف محترم کی دردمندی وغمگساری نے انھیں مسلم معاشرے کی زبوں حالی کی طرف متوجہ تو ضرور کیا ہے ؛ لیکن ان کی یہ توجہ ایسی ''مربوط فکر'' میں نہیں ڈھل سکی جو زرعی دور کی نفسیاتی حدود کو پھلانگ کر آج کے دور کے سنجیدہ مسائل کا عملی حل پیش کرسکتی ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف محترم چھکڑے میں بیٹھ کر جہاز کی سی تیزی سے سفر کرنا چاہتے ہیں ۔

''راہِ عمل'' کی جلد دوم حصہ چہارصفحہ ۸۹ پر اپنے ایک مضمون ''گناہ جو کبھی معاف نہیں ہوگا'' میں خالد صاحب نے سورۃ النساء آیت ۹۳ کے حوالہ سے مومن کے قاتل پر انتہائی شدت سے گرفت کی ہے ؛ لیکن ہمیں حیرت

ہے کہ خالد سیف اللہ رحمانی جیسی صاحبِ نظر شخصیت بھی مومن کے قاتل کے لئے مقتول کے اولیاء کی طرف سے معافی اور دیت کی قائل ہے اور اس کے لئے انھوں نے استدلال سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸ سے کیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں آیات کے جدا جدا محل ہیں، سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸ کے مطابق مقتول کے ورثا کو واضح طور پر فریق تسلیم کرتے ہوئے معاف کرنے اور دیت لینے کا حق دیا گیا ہے؛ جب کہ سورۃ النساء آیت ۹۳ کے مطابق مسلمانوں کی کوئی اجتماعی ہیئت (ریاست وغیرہ) ہی قاتل کی فریق معلوم ہوتی ہے، دیت لینا اور معاف کرنا تو کجا، قاتل کو قصاص یعنی برابری ملحوظ رکھتے ہوئے قتل کرنے سے بہت بڑھ کر عبرت انگیز انداز میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کی داخلی شہادت آیتِ مبارکہ میں قصاص کے بجائے ''جزا'' کا لفظ دے رہا ہے اور جزا کے قرآنی اطلاقات کے مطالعہ سے یہی قرآنی منشا اُبھر کر سامنے آتا ہے، ہمیں حیرت ہے کہ خالد سیف اللہ رحمانی جیسی قد رآور علمی شخصیت کی فقیہانہ نگاہوں سے ''قصاص اور جزا'' کے انتخاب واطلاق میں مضمر حکمت کیسے چھپی رہ گئی؟ حالاں کہ اس نوع کے قرآنی ونبوی اُسلوب کی شہادت وہ خود ایک مقام پر دیتے ہیں:

> قرآن مجید میں عورت کی عدت کے لئے تین 'قرء' گزارنے کا حکم دیا گیا ہے، 'قرء' کے معنی حیض کے بھی ہیں اور زمانہ پاکی کے بھی، اسی لئے بعض فقہاء نے تین حیض مدت قرار دی ہے اور بعض نے تین پاکی، ظاہر ہے کہ 'قرء' کے دونوں معانی اللہ تعالیٰ کے علم محکم میں پہلے سے تھے، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ احکام شرعیہ میں کوئی اختلاف رائے نہ ہو تو قرآن میں بجائے 'قرء' کے صریحاً حیض یا طہر کا لفظ استعمال کیا جاتا، یہی صورتِ حال احادیث نبوی میں بھی ہے، مثلاً آپ ا نے ارشاد فرمایا کہ حالتِ اغلاق کی طلاق واقع نہیں ہوتی، اغلاق کے معنی جنون و پاگل پن کے ہیں اور اکراہ و مجبوری کے بھی؛ چنانچہ اپنے اپنے فہم کے مطابق بعضوں نے ایک معنی کو ترجیح دی ہے اور بعضوں نے دوسرے معنی کو، حالاں کہ رسول اللہ ا افصح العرب یعنی عرب کے سب سے زیادہ فصیح شخص تھے، اگر آپ چاہتے تو ایسی واضح تعبیر اختیار فرماتے کہ ایک ہی معنی متعین ہو جاتا، دوسرے معنی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی ۔ (اختلاف میں اعتدال، ج:۲، ح:۴، ص:۳۲)

تشویش ناک بات یہ ہے کہ مؤلف محترم (ج:۱، ح:۲، ص:۱۰۱-۱۰۲) اسلامی ریاست میں مرتد کے قتل کے اس لئے قائل ہیں کہ اس کا ارتداد ملک وسیاسی نظام سے بغاوت کے مترادف ہے؛ لیکن جناب کی نگہِ التفات مومن کے قتل کے ''بالفعل ارتداد'' کی جانب نہیں اُٹھی، اس موضوع پر چوں کہ ہم قدرے تفصیلی بحث ماہنامہ الشریعہ میں ''قرآن مجید میں قصاص کے احکام'' کے زیر عنوان کر چکے ہیں؛ لہٰذا یہاں محض توجہ دلانے پر اکتفا کرتے ہیں۔

تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ برِعظیم میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی آمد کے بعد مسلم فکر دو متوازی دھاروں میں منقسم رہی ہے: ایک دھارا علی گڑھ تحریک کی صورت میں نمودار ہوا اور دوسرا دھارا جو اس تحریک سے بھی پہلے کسی نہ کسی روپ میں موجود تھا، اس تحریک کے بعد اس کی مخالفت میں زیادہ شدت سے اُبھرا، اس خطہ کے مسلم سماج کی داخلی تقسیم میں ان دونوں دھاروں کا تقریباً یکساں کردار رہا ہے، اگرچہ ہر دو نے اپنے اپنے فکری منہج کے مطابق مسلم سماج کی تشکیل و احیا میں بھی اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے؛ لیکن یہ دوئی اور تفریق اکیسویں صدی میں بھی پوری آب و تاب سے موجود ہے اور صورتِ حال کو تشویش ناک حد تک بگاڑنے کا باعث بن رہی ہے، خالد سیف اللہ صاحب کو اس بگاڑ کا پورا پورا احساس ہے، اس لئے ''کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات'' کے عنوان سے وسیع المشربی کا ثبوت دیتے ہوئے علماء کی توجہ مسلم سماج کے اس اہم پہلو کی جانب مبذول کراتے ہیں:

> اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ ہے جس نے جدید علوم کو حاصل کیا ہے، جیسے ہمارے علماء دین کا وجود ایک ضرورت ہے ویسے ہی عصری علوم کے ماہرین بھی ہمارے لئے بہت بڑی ضرورت ہیں، ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، یہ قوم کا بہت بڑا اثاثہ ہیں یہ عام طور پر اسلام کے بارے میں مخلص بھی ہیں، اگر کچھ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں جو دین کے مزاج و مذاق کے خلاف ہیں تو یہ زیادہ تر ان کی ناواقفیت اور نا آگہی کی وجہ سے ہے اور باہمی غلط فہمی کی وجہ سے، علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہوتی جارہی ہے، یہ بہت افسوس ناک ہے اور اس میں زیادہ تر محض باہمی دوری اور غلط فہمی کو دخل ہے، علماء کا فریضہ ہے کہ وہ اس طبقہ کو اُمت کی بہترین امانت سمجھ کر قریب کریں، ان کے شکوک و شبہات کو تحمل کے ساتھ سنیں اور محبت کے ساتھ ان شکوک کے کانٹوں کو ان کے دلوں سے نکالیں، اُمت میں جو لوگ فکری اعتبار سے راہِ مستقیم سے منحرف ہوں، ان کے ساتھ ہمارا سلوک وہی ہونا چاہئے جو ایک ہم درد اور فرض شناس معالج کا اپنے ناسمجھ مریض کے ساتھ ہوتا ہے، ہمارا رویہ ان کے ساتھ فریق اور رقیب کا نہ ہو؛ بلکہ رفیق اور صدیق کا ہو۔ (ج:۲، ح:۵، ص:۲۷-۲۳)

خالد سیف اللہ صاحب خواہ مخواہ کی قانونی موشگافیوں میں اُلجھنے کے بجائے اسلامی تعلیمات اور صدرِ اسلام کے واقعات سے استدلال کر کے چھوٹے چھوٹے نتائج فکر، قارئین کے سامنے رکھتے جاتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی نظام حیات کا کوئی ایسا واحد بڑا بیج نہیں ہوتا جس کے بل بوتے پر مقصود سماج کی تشکیل کی جاسکتی ہو؛

بلکہ ہوتا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے سچ اکھٹے ہوکر ایک بڑی سچائی کے ظہور کا سبب بنتے ہیں، اس لئے ہمارے ممدوح کا طرز استدلال عملی مثالی اور قابل تحسین ہے، اس سلسلے کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے :

> جب مدینہ میں ۸۰ر اشخاص نے اسلام قبول کیا تو آپ ﷺ نے ان کی تربیت کے لئے حضرت معصب بن عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم ہر ۸۰ر مسلمانوں پر ایک عالم ہونا چاہئے ۔ (ج:۲، ح:۵، ص:۲۵)

زیر نظر تالیف کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ خالد سیف اللہ صاحب رحمانی ''لٹھ ملا'' کے سے انداز میں اسلام کا فقط قانونی پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے ''فتویٰ'' دیتے نظر نہیں آتے ؛ بلکہ موصوف کی نگاہِ انتخاب نے دین اسلام کی سماجی جہت اور اس سے وابستہ اخلاقی قدروں کی صباحتوں کو بہت نمایاں، نہایت اجلا اور عطر بار کیا ہے، اس لئے قرآن وسنت کے وہ اہم پہلو جو علماء کی نگاہِ ناز سے عموماً اوجھل رہ جاتے ہیں، خالد صاحب کی نظر میں خاص طور پر جچے ہیں :

> ایک صاحب کا مقدمہ خدمتِ اقدس ﷺ میں آیا، گواہان نہیں تھے، اس لئے فریقین کا بیان سن کر آپ نے ایک کے حق میں فیصلہ فرمایا، پھر فرمایا کہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہوکر تمہارے حق میں فیصلہ کردیا ہو؛ حالاں کہ فی الحقیقت وہ زمین تمہاری نہ ہوتو اگر ایسا ہوتو یہ تمہارے حق میں زمین کا نہیں ؛ بلکہ جہنم کا ٹکڑا ہے، آپ ﷺ کی بات سننی تھی کہ وہ صاحب زمین سے دست بردار ہوگئے اور دوسرے فریق نے بھی قبول کرنے سے انکار کردیا، بالآخر آپ نے وہ زمین دونوں میں نصف نصف تقسیم فرمائی ، اس لئے جب تک دل کی دنیا نہ بدلے اور بنیادی فکر اور سوچ میں انقلاب نہ آئے ، سماج کو جرائم سے پاک کرنا ممکن نہیں ۔ (جرائم - مرض اور علاج، ج:۲، حد:۴، ص:۸۶)

کسی بگڑے ہوئے سماج میں، دوررس، ثمر آور اور دیرپا تبدیلی کے لئے فقط قانون کے نفاذ کے بجائے دل کی دنیا بدلنے کی نبوی حکمت سے فیض یاب ہوتے ہوئے خالد صاحب مسائل کو جڑ سے اُکھاڑنے کی بات اس طرح کرتے ہیں :

> اگر کوئی برائی جڑ پکڑ چکی ہے اور مدتِ دراز سے اس کی خو چلی آتی ہو تو بیک لمحہ اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور ایسی اصلاح سے اندیشہ ہے کہ فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو، اسی لئے احکام شریعت میں تدریج کا لحاظ رکھا گیا ہے، اکثر محرمات بتدریج حرام قرار دی گئیں اور شراب کا معاملہ تو بالکل واضح ہے، وہ تین مرحلوں میں حرام ہوئی ، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ حکمت ومصلحت کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے ،

انسان جو کچھ کہے حق کہے؛ لیکن ہر حق بات کا ہر وقت کہہ دینا ضروری نہیں، بعض دفعہ مرحلہ وار حق کا اظہار زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اگر علماء اس بات کو ملحوظ رکھیں تو بہت سے باہمی اختلاف جو مسجدوں اور دینی کاموں میں پیدا ہوجاتے ہیں، ان کی نوبت نہ آئے۔ (کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات، ج:۲، ح:۵،ص:۱۷۔۲۷)

اس اقتباس کا تنقیدی جائزہ چند سوالات جنم دیتا ہے کہ خالد سیف اللہ صاحب کیا واقعی احکامِ شریعت میں اُصول تدریج میں مضر حکمتوں کے عملی طور پر قائل ہیں؟ یا یہ محض خالی خولی لفاظی ہے یا قلم کی روانی میں یہ الفاظ غیر شعوری طور پر نکل گئے ہیں؟ محترم نے مثال بھی شراب کی دی ہے، ہم استفسار کریں گے کہ کیا شراب کی حرمت کے تدریجی احکام آج بھی اسی طرح مؤثر ہیں، جیسے عہدِ نبوی میں مؤثر تھے یا کہ ان کے پاس بھی ''ناسخ'' کا کلہاڑا موجود ہے جو انھوں نے اس مضمون کی رعایت سے تو چھپا رکھا ہے؛ لیکن کسی دوراہے پر اسے چلانے سے نہیں چوکیں گے اور ''منسوخ'' کے ڈھیر لگاتے جائیں گے؟ بڑی عجیب بات ہے کہ ایسے فقہاء جو کئی آیات مبارکہ کو منسوخ قرار دیتے ہیں، ان کی نگاہوں سے یہ سامنے کی بات کیسے اور کیوں کر اوجھل رہ جاتی ہے کہ ان کے اس طرزِ استدلال سے احکامِ شریعت کے اُصول تدریج کی حکمتیں کافور ہوجاتی ہیں، اس سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ ''اکمل دین'' کی غلط تعبیر کی آڑ میں وہ قرآن مجید میں مذکور کفار کے اس اعتراض کو ایک لحاظ سے حق بجانب قرار دیتے ہیں کہ قرآن مجید پورے کا پورا ایک ہی بار نازل کیوں نہیں کر دیا جاتا، پھر اس سے بھی زیادہ بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت کے اس منشا کو جو اللہ وتبارک تعالیٰ نے کفار کے اعتراض کے باوجود، نزولِ قرآن مجید کے سلسلے میں جاری وساری رکھی، نہ صرف بیک جنبش قلم نظرانداز کر دیا جاتا ہے؛ بلکہ اس کے ساتھ نتیجے کے طور پر یہ بھی باور کرادیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام ﷺ جیسی تاریخ کی منتخب شخصیات کو (جن کے درمیان نبی خاتم ﷺ بنفس نفیس موجود تھے) تدریجی احکام کی اس لئے ضرورت تھی کہ شراب نوشی جیسی برائیاں ان کی ''خو'' میں موجود تھیں؛ جب کہ اب (یعنی عہدِ صحابہ کے بعد) منسوخ احکام اس لئے منسوخ قرار دیئے گئے ہیں کہ لوگ خودکار انداز میں کسی تربیت کے بغیر ہی، صرف مسلمانوں والا نام رکھنے سے ایسی کسی ''خو'' سے چھٹکارہ پاکر صحابہ کرام ﷺ جیسی پارسائی پاسکتے ہیں جس سے صحابہ، رسول اللہ ﷺ کی راہنمائی میں آہستہ آہستہ بتدریج مشرف ہوئے (سبحان اللہ)، مطلب یہ ہوا کہ آج کے نومسلم کو منسوخ احکام کی رعایت حاصل نہیں ہے، اسے اسلام قبول کرنے کے فوراً بعد شراب نوشی وغیرہ جیسی برائیوں سے (جو اس کی گھٹی میں پڑی ہیں) فوراً کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہئے، یعنی صحابہ کرام کے لئے تدریجی احکام اور آج کے نومسلم یا نام کے مسلم کے لئے غیر تدریجی فقط آخری ناسخ حکم، پھر کہئے سبحان اللہ؛ چوں کہ ہم ماہنامہ الشریعہ میں بعنوان ''معاصر تہذیبی تناظر میں مسلم علمی روایت کی تجدید'' اس سلسلے میں اُصولی بحث کر چکے ہیں؛ لہٰذا یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اتنا ضرور چاہیں گے کہ خالد

سیف اللہ صاحب اس موضوع پر اپنا موقف اُمت کے سامنے ضرور رکھیں کہ آج کی عالمگیریت کی فضا میں ایسے موضوعات پر واضح ہونا بہت ضروری ہے، ویسے ان کے ایک مضمون (زنا کی سزا-موجودہ سماجی ماحول میں) سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شرعی احکامات کی تنفیذ میں مطلوب تقاضوں اور مقاصد پر گہری نظر رکھتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

> ہندوستان میں اولاً تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی وی نے حیا کی چادر اُتار پھینکی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی عشقیہ گانے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنادیا ہے، تعلیم گاہوں سے لے کر دفاتر تک ایک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں؛ بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا پھانسی کو قرار دینا میرا خیال ہے کہ کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی، اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے ''دارالاسلام'' کی شرط لگائی ہے، زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے؛ لیکن تقاضائے انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محل نظر ہے؛ اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے، جو جرم کے عوامل و محرکات کو روک سکیں اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے، جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے۔ (ج:۱، ح:۲، ص:۲۰۱-۲۰۲)

خالد صاحب کے موقف سے بحیثیت مجموعی اتفاق کرنا پڑتا ہے؛ لیکن وہ فقہاء کی شرط ''دارالاسلام'' تائیدی انداز میں لائے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ آج کی عالمگیریت کی فضا میں دارالاسلام اور دارالحرب میں دنیا کی تقسیم محل نظر ہے، جدید گلوبل دنیا، ایک نئی فقہ کا تقاضا کر رہی ہے، دینی اخلاقیات کے کلی مفاہیم اگر پیش نظر رکھے جائیں تو جدید دنیا دارالدعوۃ قرار پاتی ہے اور اسی دارالدعوۃ کی بنیاد پر گلوبل فقہ کی پر شکوہ عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔

اب ہم قارئین کے لئے زیر نظر تالیف میں سے چند ایسے اقتباسات نقل کرنا چاہیں گے، جن سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے ممدوح کے ہاں انسانی زندگی کے ایسے منفی پہلو، جنھیں توجہ کا مرکز بنائے بغیر صحت مند سماج کی تشکیل

نہیں کی جاسکتی، کس قدر اہمیت کے حامل ہیں، قابل افسوس بات ہے کہ مسلم سماج اور اس سے وابستہ و پیوستہ اخلاقی اقدار کی بازیافت اور استقلال اکثر علماء کے بیان و ابلاغ میں 'متروک کے منصبِ جلیلہ' پر فائز ہو چکے ہیں، اس اعتبار سے موصوف کی تحریر کا یہ نمایاں پہلو گویا 'فرض کفایہ' کی ادائیگی کی ایک سبیل بھی ہے، ملاحظہ کیجئے :

عین میدانِ جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ ﷺ کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی اور مرضِ وفات میں اس وقت بھی آپ نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا جب خود چلنے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی؛ لیکن اس کے باوجود قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لئے آپ اپنے رفقا کے ساتھ بنفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی۔ (صلح کرانا - ایک اہم اسلامی فریضہ، ج:۲، ح:۴، ص:۵۳)

منشیات کی مضرتوں کا سماجی پہلو یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے جس سے مختلف لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہیں، ایک شخص باپ ہے تو اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرنی ہے، نہ صرف اس کے روزمرہ کی کھانے پینے کی ضروریات کو پورا کرنا ہے؛ بلکہ اس کی تعلیم کی بھی فکر کرنی ہے، وہ بیٹا ہے تو اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اگر خاندان کے دوسرے بزرگ موجود ہوں تو ان کی پرورش کا بار بھی اُٹھانا ہے، شوہر ہے تو یقیناً بیوی کے حقوق اس سے متعلق ہیں، بھائی ہے تو چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش اور شادی بیاہ کا فریضہ اسی کے کاندھوں پر ہے، نشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور غافل بنادیتا ہے اور اس بدمستی میں نہ اس کو لوگوں کے حقوق یاد رہتے ہیں، نہ اپنے فرائض و واجبات، بعض اوقات تو وہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی تباہ و برباد کردے۔ (منشیات - بڑھتا ہوا سماجی ناسور، ج:۲، ح:۴، ص:۱۴۸)

مذہب کی راہ سے جو رشوت آتی ہے وہ تقدس کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہوتی ہے، لوگوں کو اس کے رشوت ہونے کا خیال بھی نہیں ہوتا، اس مذہبی رشوت کی حقیقت جاننے کے لئے کلیساؤں کی تاریخ پڑھئے، جہاں مغفرت نامے فروخت کئے جاتے تھے ...... مذہبی رشوت کی روایت آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے، قادیانی

حضرات کے یہاں آج بھی بہشتی مقبرہ، قادیان میں اصل اور دوسرے مقامات پر اس کی نقل کی شکل میں موجود ہے، جس میں کثیر رقم لے کر تدفین کی اجازت دی جاتی ہے اور لوگ اس تصور کے ساتھ اس میں دفن ہوتے ہیں کہ یہاں دفن ہوتے ہی اب وہ داخل بہشت ہوں گے......اگر کسی لڑکے کے بارے میں یہ بتایا جائے کہ یہ چور اور ڈاکو ہے تو شاید ہی کوئی شخص اس سے رشتہ کرنے کو تیار ہو؛ لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں شخص کی اوپر کی آمدنی اتنی ہے، ماں باپ اس کی ہوشمندی کے ثناخواں ہوتے ہیں اور لوگ اپنی لڑکی کے لئے اس مہذب چور بلکہ سینہ زور کا انتخاب کرتے ہیں۔ (رشوت اور ہمارا سماج، ج:۲، ح:۴، ص:۱۳۸-۱۴۰)

خالد سیف اللہ صاحب، دین کی سماجی تعبیر پر یقین رکھتے ہیں، اس لئے وہ آدم بیزار صوفیوں کی طرز پر کسی گوشے میں بیٹھ کر ’خاموش رہنے کی آزادی‘ سے بہرہ مند نہیں ہونا چاہتے، انھوں نے ایک روایت سے Social Activism کی ایسی راہ نکالی ہے، جو سماج کی خاموش اکثریت کو لب کشائی پر آمادہ کرتی ہے، ملاحظہ کیجئے :

احتجاج کے لئے ایسے ذرائع کا اختیار کرنا جس سے عام لوگوں کو نقصان نہ پہنچے، اس کی بھی گنجائش ہے، حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے اذیت پہنچاتا رہتا ہے، آپ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اپنا سامان نکال کر راستہ پر رکھ دو، اس شخص نے اپنا سامان نکال لیا اور راستہ پر ڈال دیا، جو بھی وہاں سے گذرتا استفسار حال کرتا، وہ شخص کہتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے، اس لئے میں یہ سامان باہر نکال رکھا ہے، گزرنے والا کہتا اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ اسے رسوا کرے، آخر پڑوسی آیا اور اس نے درخواست کی کہ اپنے گھر لوٹ چلو، اب میں تم کو کبھی اذیت نہیں دوں گا۔ (ہڑتال - اسلامی نقطۂ نظر، ج:۱، ح:۳، ص:۸۸)

معاصر مسلم سماج کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ دین کے نام پر لوگوں کے لئے مسائل کے انبار کھڑا کرنے کی روش ہے، اگر مذہبی حلقے کو اس طرف متوجہ کیا جائے تو عام طور پر یہی سننے کو ملتا ہے کہ ایسے اُمور میں دنیاوی لحاظ سے لوگوں کو تکلیف نہیں ہوتی ؛ لیکن خدا کے لئے ایسا کیا جائے تو لوگ چوں چراں کرتے ہیں، خالد صاحب نے بلا جھجھک ایسے نام نہاد دینی شعائر کی بیخ کنی کرتے ہوئے ایک طرف مذہبی رویے کی اصلاح کی ہے اور دوسری طرف بال سِوِل سوسائٹی کے کورٹ میں پھینک دی ہے کہ وہ اصلاحِ احوال کے لئے اپنا کردار کرے :

قرآن کی تلاوت میں بھی آواز کو معتدل ہونا چاہئے ......فقہاء نے بھی اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے؛ چنانچہ مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں کہ: ''امام جماعت کے اعتبار سے ہی جہر کرے گا اگر اس سے زیادہ زور سے پڑھے تو اس نے نامناسب عمل کیا'' علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ ''اتنی بلند آواز جو خود اس کو تھکا دے اور دوسرے کے لئے اذیت کا باعث ہو، اچھی بات نہیں'' ......اسلام میں صرف اذان کے لئے بلند آواز کو پسند کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس کا مقصد ہی اظہار واعلان ہے اور وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اسی لئے اس خدمت پر مامور فرمایا کہ ان کی آواز بلند تھی؛ لیکن اذان میں بھی ایسی ہی آواز مطلوب ہے جو اہل محلّہ تک پہنچ جائے، سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک صاحب نے اذان دی اور آواز کو بلند کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا تو آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ......ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج میں اسلامی زندگی کے صحیح خدوخال پیش کریں۔ (عبادت گاہوں سے صوتی آلودگی پھیلنے کا مسئلہ، ج:۱، ح:۳، ص:۷۹-۸۱)

خودسوزی کے تو بہت سے واقعات پیش آتے رہتے ہیں؛ لیکن مال سوزی اور اپنا مال آپ جلانے کے واقعات شاذ ونادر ہی پیش آتے ہیں؛ بلکہ اگر کوئی شخص اپنا مال آپ جلالے تو لوگ اسے پاگل اور دیوانہ ہی سمجھیں گے؛ لیکن مال سوزی کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں جو ہیں تو پاگل پن ہی؛ لیکن معاشرہ انھیں پاگل نہیں کہتا، شادیوں میں جو پٹاخہ بازیاں ہوتی ہیں، کیا یہ اپنے پیسوں کو آپ جلانا نہیں ہے؛ شبِ براءت ایک مبارک رات ہے، عبادت اور ذکر وتلاوت کی رات ہے؛ لیکن کیا مسلمان محلوں میں یہ رات پٹاخوں کی گھن گرج اور آتش بازیوں کی خیرہ کردینے والی روشنیوں سے نہیں پہچانی جاتی ہے؟ ......آتش بازی کی وجہ سے لوگوں کا آرام وسکون غارت ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کو دقت پیش آتی ہے؛ بلکہ کئی ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ لوگوں کی جانیں تک چلی گئیں یا بعض گھروں کو آگ لگ گئی، دوسروں کو ایذا رسانی حرام اور گناہِ شدید ہے، رسول اللہ ﷺ کو جب کسی گھر پر دستک دینا ہوتا تو ہتھیلیوں کے بجائے انگلیوں کے پور سے دستک دیتے؛ تاکہ بے ہنگم اور غیر متوازن آواز نہ ہو۔ (اپنے روپے آپ نہ جلایئے، ج:۲، ح:۴، ص:۱۲۶-۱۲۷)

مغربی سماج کو بے جا ڈسپلن کی وجہ سے چیونٹیوں کا سماج کہا جاتا ہے، جب کہ مشرقی سماج بھیڑ چال کا عادی ہے، خالد سیف اللہ رحمانی، اس بھیڑ چال پر اپنی خفگی کا اظہار کرنے سے نہیں چوکے، وہ مذہبی حلقے سے خاص طور پر نالاں ہیں کہ عملی افادیت کے حامل ایسے اقدامات، جن کے ذریعے سماجی تبدیلی کے امکانات وا ہو سکتے ہیں؛ کیوں کر اختیار نہیں کئے جاتے :

> اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ساری تعلیمی اور دعوتی سرگرمیاں شہروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں، شہر میں نہ صرف یہ کہ ہمارے دینی تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بعض مقامات پر جوزائد از ضرورت ادارے قائم ہو رہے ہیں، چھوٹے چھوٹے محلوں میں ایک سے زیادہ درسگاہیں قائم ہیں، وہاں طلبہ کی تعداد اتنی کم ہے کہ ایک ادارہ ان کے لئے کافی تھا، پھر ان اداروں میں باہم کمرشیل اداروں کی طرح رقابت اور منافست کی کیفیت بھی ہے، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمیٹی میں اختلاف ہو گیا، ایک گروہ مدرسہ پر قابض ہو گیا، دوسرے گروہ نے قریب ہی دوسرا مدرسہ کھول لیا، گویا ادارے ضرورت یا خدمت کی کسی نئی جہت کے لئے قائم کرنے کے بجائے محض مقابلہ اور تفاخر کے جذبہ سے بھی قائم کئے جا رہے ہیں، یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایک دینی کام دینی جذبہ سے خالی ہو کر انجام دیا جائے۔ (دینی مدارس کے فضلاء-صبر وبرداشت ضروری ہے، ج:۲، ح:۵، ص:۶۳-۶۴)
>
> زبان سمجھنے اور سمجھانے کا محض ایک ذریعہ ہے، زبان کبھی مقصود نہیں ہوتی، نہ زبان کا کوئی مذہب اور عقیدہ ہوتا ہے......لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اب بھی دین داروں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو عربی اور اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو اچھوت اور بے برکت سمجھا ہوا ہے اور صرف اُردو زبان میں تھوڑا سا کام کر کے قانع اور مطمئن ہے کہ اس نے اسلام کی دعوت کا حق دار کر دیا ہے۔ (دعوتِ سب سے اہم فریضہ، ج:۱، ح:۱، ص:۳۰۷-۳۰۸)

رفع یدین، نور بشر، حیاتی مماتی وغیرہ، جدید تکنیکی دور میں بھی علماء دین کے پسندیدہ موضوعات ہیں، ہمیں حیرت نما خوشی ہے کہ خالد سیف اللہ صاحب، سماجی اصلاح و اُخروی نجات کے لئے خود کو ان موضوعات کا مکلّف نہیں ٹھہراتے؛ بلکہ متقدمین کے نقوش کی پیروی میں خیر تلاش کرتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں :

> امام شافعیؒ کے ایک شاگرد یونس بن عبد الاعلیٰ صدفی ہیں، ان کا ایک بار اپنے استاذ امام شافعیؒ سے ایک مسئلہ میں بھی مباحثہ ہو گیا اور دونوں کسی ایک رائے پر متفق نہ

ہو سکے، پھر جب امام شافعیؒ کی ان سے ملاقات ہوئی تو امام صاحبؒ نے ہاتھ تھاما اور فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ گو ایک مسئلہ میں بھی ہمارا اتفاق نہ ہو؛ لیکن پھر بھی ہم بھائی بھائی بن کر رہیں ......اختلاف کو مذموم سمجھنا سلف کے طریقہ کے بھی خلاف ہے اور عقل سلیم کے بھی مغائر،ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اختلافات کے معاملہ میں انسان کا قلب وسیع ہو، تمام سلف صالحین کے بارے میں اس کی زبان محفوظ اور اس کا قلم محتاط ہو ، وہ صلحائے اُمت کے اختلاف کے بارے میں حسن ظن رکھے اور اختلاف رائے کو برداشت کرے، یہ وہ مسائل نہیں ہیں جن کی اُمت پر تبلیغ کی جائے اور اس کو اپنی دعوت کا موضوع بنایا جائے ، اسی طرح اعتقادی احکام کی تشریح میں اہل سنت والجماعت کے درمیان جو معمولی سا اختلاف ہے اور اکثر یہ اختلاف محض تعبیر کا ہوتا ہے، ان میں غلو اور ان کی بنیاد پر دوسروں کو گمراہ قرار دینا نہایت ہی مذموم اور ناشائستہ بات ہے۔(اختلاف میں اعتدال، ج:۲، ح:۴، ص:۳۶)

یوں تو اختلاف کے مختلف اسباب ہیں، سیاسی، خاندانی، کاروباری وغیرہ؛ لیکن مذہبی اختلاف کا مسلم سماج پر زیادہ گہرا اثر پڑتا ہے اور اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مساجد، دینی درسگاہیں اور دینی اجتماعات اور مذہبی تقریبات جن کو اُمت کے اتحاد واتفاق کا نمونہ ہونا چاہئے ، وہی اختلاف وانتشار کا سبب بن جاتے ہیں اور جو لوگ اُمت کو جوڑنے کا کام کرتے ہیں ، وہی اختلاف کے علم بردار بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں، تو ایسی صورت میں کون ہے جو ان بکھرے ہوئے تسبیح کے دانوں کو پرو سکے اور شکستہ دلوں پر مرہم رکھ سکے۔(کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات، ج:۲، ح:۵، ص:۲۷)

اگر سونے چاندی یا مٹی اور پتھر کی مورتیاں بنادی جائیں ان کو ایک جگہ بٹھا دیا جائے تو یقیناً اختلاف نہ ہوگا ، نہ کوئی اپنی جگہ سے آگے بڑھے گی نہ پیچھے ہٹے گی نہ ایک دوسرے کے خلاف اظہار خیال کرے گی ؛ لیکن چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے جیتے جاگتے انسان کو اس طرح متفق اور مہر بہ لب رکھنا ممکن نہیں ......اس لئے جیسے 'اتحاد' سیکھنے کی ضرورت ہے اسی طرح ' اختلاف' بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔(اختلاف کا طریقہ، ج:۲، ح:۴، ص:۳۸)

اگر کوئی انسان چاہے کہ تمام انسان اسی کے ہم رنگ ہو جائیں، جس طرح وہ

سوچتا ہے، اسی طرح سب سوچیں، اس کی پسند سب کی پسند ہو اور اس کی ناپسند سب کی ناپسند ہو، تو انسانی سماج مختلف پھولوں کا گلدستہ نہ رہے گا؛ بلکہ سرسوں کا کھیت بن جائے گا کہ پورا کھیت زرد اور یک رنگ نظر آئے ...... یکجہتی تو اس طرح ممکن نہیں کہ تمام انسانیت ہم رنگ ہوجائے، ان میں فکر ونظر، تہذیب وتمدن اور زبان و بیان کا کوئی فرق باقی نہ رہے، ایسی یکجہتی تو شاید قبرستان کے شہر خموشاں کے سوا کسی زندہ انسانی آبادی کے درمیان ممکن نہ ہو، یکجہتی ''جیو اور جینے دو'' کے اُصول پر ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔ (قومی یکجہتی- کیوں کہ اور کس طرح، ج:۲، ح:۴، ص:۶۶-۶۷)

سماجی حالات کے موافق، سماجی اخلاقیات کی ترجیحات میں تغیر وتبدل، بعض اوقات بہت ضروری ہوتا ہے؛ لیکن مسلم سماج میں ایسے افراد کی کمی نہیں، جو اسلامی اخلاقیات کی سماجی جہت سے نابلد رہنے کے باعث، اخلاقی بے راہ روی کا سبب بنتے ہیں، ایسے افراد ذہنی حالت کے لحاظ سے اپنے تئیں متقی بنے ہوتے ہیں، تقویٰ کا ہیضہ ان سے، حالات کی نبض پر انگلی رکھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے، نتیجے کے طور پر 'ذریعہ' مقصد بن جاتا ہے اور مقصود 'خیر' روپوش ہوجاتا ہے، خالد سیف اللہ صاحب رحمانی نے کسی قسم کے تحفظات کے بغیر، اسلامی اخلاقیات کی اس گم گشتہ جہت کو بے نقاب کیا ہے :

ایسی سچائی جو سماج کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچائے، جو خیر کی اشاعت کے بجائے بدی کی تشہیر کا باعث ہو، جو لوگوں کو شرافت وصالحیت کے بجائے بدخوئی کی طرف لے جاتی ہو، اس سچائی کو ظاہر کرنے سے چھپانا بہتر ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے؛ کیوں کہ یہاں جھوٹ بہ مقابلہ سچ کے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اگر ایک مظلوم اور کمزور شخص نے آپ کے یہاں پناہ لے رکھی ہے، ایک بے بس عورت اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کے لئے چھپی ہوئی ہے اور ایک ظالم اس مظلوم کے قتل اور ایک اوباش اس عورت کی عصمت ریزی کے درپے ہو اور آپ کے جھوٹ سے اس شخص کی جان اور اس عورت کی عزت بچ سکتی ہو اور آپ کے سچ سے جان جاسکتی ہو اور ایک عورت کی چادرِ عفت تار تار ہوجانے کا اندیشہ ہو تو ضرورت ہے کہ ان حالات میں آپ کے لئے جھوٹ بولنا ہی واجب ہے اور سچ بولنا اس جرم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ (پانی-جس نے آگ لگادی، ج:۲، ح:۴، ص:۱۶۰)

اپنے ایک مضمون ''مذہب کی تبدیلی'' میں خالد سیف اللہ صاحب نے ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ

اور اسلام کے عدم فروغ کے اسباب کے واقعات تجزیے سے سماجی مفاہیم اخذ کئے ہیں :

> یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت کا کوئی سماجی تشخص نہیں ہے، شادی، بیاہ، سماجی رسم ورواج وغیرہ میں وہ ہندو سماج ہی کا ایک حصہ بن گئے ہیں......اس لئے جب کوئی ہندو عیسائی مذہب قبول کرتا ہے تو اسے بہت ہی معمولی تبدیلیوں سے گزرنا پڑتا ہے، اس کی عملی زندگی میں تو کوئی انقلاب آتا ہی نہیں اور اسے فکر وعقیدہ کے اعتبار سے بھی کسی غیر معمولی تبدیلی سے گزرنا نہیں پڑتا......اسلام مذہب کے معاملہ میں دورنگی اور دوعملی کو روا نہیں رکھتا، اسلام قبول کرنے کا مطلب خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ نہیں؛ بلکہ اللہ سے رشتہ جوڑ کر تمام توہمات سے رشتہ توڑنا ہے......گویا مسلمان ہونے کے بعد انسان ایک سماج سے دوسرے سماج کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ (ج:۱، ح:۲، ص:۱۰۰)

اس اقتباس کے آخری جملے کی معنویت پر غور کیجئے کہ دین اسلام کی اصالت اور معاشرتی رموز سے اس کے ربط کو کتنا ایجازی رنگ دیا گیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ فکر اسلامی کی اصالت میں مضمر سماجی دلالتوں پر ہمارے محترم کی نہایت گہری نظر ہے، اس کا بخوبی اندازہ ان کی ان تحریوں سے ہوتا ہے جن میں خواتین کی سماجی حیثیت اور نسائی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں مثال کے طور پر :

> حقیقت یہ ہے کہ تعددِ ازدواج کی اجازت ایک سماجی وعمرانی ضرورت اور عفت و پاک دامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور اپنے نتائج واثرات کے اعتبار سے خود عورتوں کے لئے بعض حالات میں باعث رحمت ہے؛ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ تعددِ ازدواج کے لئے شریعت نے جو حدود وقیود مقرر کی ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے ورنہ یہ قانون حکم شریعت کا استعمال نہیں؛ بلکہ 'استحصال' ہوگا۔ (تعددِ ازدواج کا مسئلہ، ج:۱، ح:۲، ص:۴۷)
>
> بعض نوجوان اصل شباب گزارنے کے بعد، جب عمر میں ڈھلاؤ شروع ہوتا ہے تو نکاح کرتے ہیں، یہ نہایت ہی غلط رجحان ہے اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں......افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دیر سے نکاح کرنے کے واقعات زیادہ تر تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال خاندان میں پیش آتے ہیں، اس لئے اس کو معاشی مفلوک الحال کا نتیجہ قرار دینا قرین انصاف نہیں...... یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں مطلقہ عورتوں اور بیوہ خواتین کے نکاح کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے؛ بلکہ بچوں کی پرورش کے نام پر اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے، یہ صحیح سوچ نہیں ہے......رسول اللہ ﷺ

نے جن ازواج مطہرات سے نکاح فرمایا، ان میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری تھیں، حضرت زینبؓ مطلقہ تھیں اور باقی اُمہات المومنین بیوہ تھیں، خود رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ، حضرت اُم کلثومؓ، ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے منسوب تھیں، ابولہب کے کہنے پر ان بدبختوں نے طلاق دے دی، آپ ﷺ نے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں دیا......جن مردوں کی بیویوں کا انتقال ہوگیا ہے ان کے دوبارہ نکاح کرنے کو بھی پسند نہیں کیا جاتا، بعض لوگ تو سن رسیدہ لوگوں کی بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کرنے کو حرص و ہوس سمجھتے ہیں اور خود بال بچے والد کے نکاح کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں ...... فقہاء نے لکھا ہے کہ بہ وقت ضرورت باپ کا نکاح بھی اولاد پر اس کا ایک حق ہے۔ (ایک اہم سماجی مسئلہ، ج:۲، ح:۴، ص:۱۹۹-۲۰۲)

لیکن انسانی تجارت کی ایک اور صورت ہے جو اس وقت سماج کے مہذب لوگوں کے درمیان رائج ہے، جس میں انسان اپنے لڑکوں کو آپ فروخت کرتا ہے اور فروخت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حسرت وافسوس کے آنسو نہیں؛ بلکہ خوشی کے آنسو ہوتے ہیں، دل حسرت و یاس کی تپش سے اُبلتا نہیں؛ بلکہ حسین آرزوؤں کے تصور سے اُچھلتا اور کودتا ہے، یہ عجب منڈی ہے جہاں پڑھے لکھے، اہل دانش، اصحابِ ثروت، اعلیٰ عہدوں پر فائز خوشی خوشی اپنے لڑکوں کا سودا لے کر آتے ہیں اور اس کی تعلیم، معاشی امکانات، خاندانی پس منظر، یہاں تک کہ شکل وصورت اور آبا واجداد کی شرافت کی دہائی دے کر ڈاک لگاتے اور زیادہ سے زیادہ قیمت کے خواستگار ہوتے ہیں، انھیں اپنے لڑکوں کو فروخت کرنے اور ان کی جوانی کی قیمت لگانے میں نہ کوئی شرم ہوتی ہے نہ کوئی عار، آپ سوچیں گے یہ کونسی منڈی ہے؟ کیا کوئی ماں باپ اپنے لڑکوں کو بیچ بھی سکتا ہے، کہیں انسانوں کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا عہد غلامی پھر واپس آ گیا ہے؟ لیکن آپ کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، ہمارا پورا سماج انسانی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے، ہر گھر میں ایک دکان ہے اور ہر خاندان میں کچھ تاجر اور کچھ گاہک ہیں......کیا لڑکی والوں سے گھوڑے جوڑے کے نام پر رقم وصول کرنا، ان سے جہیز کا مطالبہ کرنا، اپنے مدعوین کو ان کے سر تھوپ دینا

اوران سے منھ مانگا کھانا طلب کرنا، تجارت اوراپنے لڑکے کی قیمت لگانا نہیں ہے؟
قیمت روپیوں میں بھی ادا کی جاتی ہے، سامان واسباب کے ذریعہ بھی اور ہوٹلوں میں
شکم پروری کے ذریعہ بھی، یہ سب قیمت کے مختلف عنوان اورالگ الگ انداز ہیں،
لڑکا اور اس کے والدین ان تمام طریقوں سے لڑکے کی قیمت وصول کرتے ہیں
اوراس کی جوانی کا منھ مانگا دام پاتے ہیں، اس کے تجارت ہونے میں کیا شبہ ہے؟
...... جوانی کی قیمت تو جانوروں کی لگائی جاتی تھی اوراعلیٰ نسل کے جانور حاصل کئے
جاتے تھے، کیا شادی کے موقع سے لڑکے والوں کی جانب سے مطالبہ اس حیوانی
کردار کی پیروی نہیں ہے اور جولوگ پیسے لے کر شادی کرتے ہیں، کیا وہ مردانہ تعظیم
ووقاراور بحیثیت شوہر تکریم وتوقیر کے مستحق ہیں؟ جب کہ قرآن نے مردوں کو بلند
رتبہ اس بنیاد پر قرار دیا تھا کہ وہ خرچ کرتے ہیں اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونچا یعنی
دینے والا ہاتھ نچلے یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، تو جو شوہر اپنا ہاتھ نیچے رکھتا ہو
اور اپنی بیوی اور اس کے اولیا کو اپنا ہاتھ اونچا رکھنے پر مجبور کرتا ہو، وہ کیسے اپنی بیوی
سے بلند رتبہ ہوسکتا ہے؟...... تاجر خریدار کا احسان مند ہوتا ہے نہ کہ خریدار تاجر کا اس لئے
جس لڑکی اوراس کے سرپرست نے دولہا کی قیمت ادا کی ہے، آخر وہ اس مرد اور اس
کے اہل خانہ کے احسان مند کیوں کر ہوں، جس کی قیمت ان لوگوں نے اپنا خون جگر
بیچ کر ادا کی ہو، اسی لئے آج کل یہ شکایت عام ہے کہ جب بہو گھر میں آتی ہے وہ
خدمت اطاعت کے جذبہ سے خالی وعاری ہوتی ہے اور گھر سے متعلق فرائض اور اپنی
ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہ۔ (لڑکوں کی تجارت، ج:۲، ح:۴، ص:۲۰۸-۲۱۳)

جدید تکنیکی ترقی نے انسانی سماج پر مثبت اثرات مرتب کئے ہیں اس سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ زیرنظر تالیف میں خالد سیف اللہ صاحب بھی اس کی سماجی افادیت کے قائل معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن ان کی تیکھی نظر سے جدید تکنیک کی ایسی خامیاں چھپی نہیں رہ سکیں، جو انسانی سماج کو کسی بڑے اخلاقی بحران سے دوچار کرسکتی ہیں :

ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ اجنبی مرد وعورت کے مادہ تولید کو بارآور کرنا یا اجنبی اور غیر
معروف مردوں کے مادہ تولید کو عورت کے رحم میں منتقل کرکے اس کو ماں بنانا کھلی
ہوئی بدکاری اور انسانوں کو حیوان کی سطح پر اُتارنا ہے، انسان کو نسب اور اپنی شناخت
سے محروم کردینا اخلاق وشرافت کے بالکل مغائر ہے اور شاید ہی کوئی مذہب ہو جو اس

کو جائز رکھتا ہو،اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں،آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے یہ قطعاً حلال نہیں کہ وہ اپنے پانی یعنی مادہ تولید سے دوسرے کی کھیتی یعنی اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور خاتون کے رحم کو سیراب کرے۔ (پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے، ج:۲، حد:۴، ص:۱۸۸)

چند سو روپے خرچ کر کے (Sex Determination Test) کرایا جاسکتا ہے اور معلوم کیا جاسکتا ہے کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی ؟ ایک معمولی اندازہ کے مطابق اس ٹیسٹ پر مبنی اطلاعات کی روشنی میں روزانہ پانچ تا چھ سو لڑکیاں اس عالم رنگ و بو میں آنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہیں، یہ قتل دشمنوں اور غیر سماجی عناصر یا غنڈوں کے ذریعہ نہیں ہوتا؛ بلکہ شفیق باپ اور ''ممتا سے معمور ماں'' کے ہاتھوں ہوتا ہے اور خاندان کے بزرگوں اور خیر خواہوں کا مشورہ بھی اس میں پوری طرح شریک رہتا ہے، گو انسانی حقوق اور خواتین کی مختلف تنظیموں کے احتجاج اور مطالبہ پر قانوناً ایسے ٹیسٹ کو منع کر دیا گیا ہے؛ لیکن جب تک اندازِ فکر میں تبدیلی نہ آئے، قانون شکنی کو کب روکا جاسکے گا ؟ ......اگر ہم صرف والدین کو دختر کشی کی اس ''جاہلیت جدیدہ'' کا مجرم قرار دیں تو شاید انصاف نہ ہو، پورا سماج اس کا مجرم ہے، وہ ظالم سماج جو اپنے لڑکوں کو بازار کے سامان کی طرح اونچی قیمتوں پر فروخت کرتا ہے، جو چاہتا ہے کہ لڑکیوں کے والدین سے ان کی رگِ گلو کا آخری قطرہ خون بھی وصول کرلے، جس کو حرص وطمع نے سیم و زر کا ایسا پیاسا بنا دیا ہے کہ جیسے کوئی سگ گزیدہ مریض اور جس کی بے رحمی وشقاوت اور سنگ دلی پر شاید درندے بھی شرماتے ہیں، جب تک ہم اس اصل مرض کا علاج کرنے میں کامیاب نہ ہوں، دختر کشی کی اس نئی لہر کو روک نہیں سکتے۔ (دختر کشی- عہدِ جدید میں، ج:۲، ح:۴، ص:۱۹۶-۱۹۷)

ذرا غور کیجئے کہ خالد صاحب نے جدید تکنیک کے ایک غلط استعمال کو، سماج کے گرے ہوئے روپے سے کیسے (Relate) کیا ہے، انھوں نے تکنیکی ترقی کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا اور نہ ہی 'قانون' نافذ کرنے کے لئے آستینیں چڑھا کر چیخ پکار کی ہے، وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ معلوم ہوتے ہیں کہ قانونی سزا کے بجائے سماجی سزا زیادہ خوف ناک ہوتی ہے، قانون کا شکار صرف مجرم ہوتا ہے جب کہ سماج کی دی ہوئی سزا مجرم کے پورے خاندان اور اس کی آنے والی نسل کو بھی جھیلنی پڑتی ہے، اس لئے کسی متوقع مجرم کا خاندان، سماجی کلنک کے ڈر سے اسے قابو میں رکھتا ہے،

درج ذیل اقتباس سے ان کی سوچ کے اس رُخ پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ محض قانون بنا کر بری الذمہ نہیں ہوا جاسکتا؛ بلکہ لوگوں کو متحرک کر کے ہی حقیقی اصلاح کی جاسکتی ہے :

> پھر خاص کر اسلام نے مردوں پر عورتوں کی حفاظت کی ذمہ داری رکھی ہے اور یہی مطلب ہے کہ مرد کے '' قوام'' ہونے کا، اسی لئے سماجی حقوق میں اسلام نے اکثر مواقع پر خواتین کو مقدم رکھا ہے ......غرض طلاق اور کسی مناسب ضرورت کے بغیر دوسرا نکاح ایک '' ناخوش گوار واقعہ'' ہے؛ لیکن یہ اس سے زیادہ ناخوش گوار واقعہ کو روکنے کا باعث ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی اجازت دی ہے ......اور ان سب کے باوجود حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو بدترین لوگ ہوں گے وہی عورتوں پر ہاتھ اُٹھائیں گے ......ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کو اس سلسلے میں باشعور بنایا جائے، توہماتی تصورات سے ان کو آزاد کیا جائے، معاشرہ میں حوصلہ و ہمت پیدا کیا جائے کہ اگر ایک ہاتھ ظلم وجور کے لئے اُٹھے تو کتنے ہی ہاتھ اس ہاتھ کو روکنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں، کتنی ہی زبانیں اس پر لعن طعن کے تیر برسائیں اور سماج میں وہ اپنے آپ کو تنہا اور الگ تھلگ محسوس کرنے لگے، ہر آنکھ جو اس پر اُٹھے وہ اسے اس کی ذلت ورسوائی کا احساس دلائے اور ہر زبان جو اس پر کھلے وہ اس کی شناعت اور گراوٹ کا اعلان کرنے لگے۔ (ایک حادثہ-لرزہ خیز، الم انگیز، ج:۲، ح:۴، ص:۹۵-۹۹)

کسی سماجی مسئلے کی گتھی سلجھانے کے لئے مصلح کا غیر جانب دار ہونا نہایت ضروری ہے، یہ صفت مصلح کو تحریک دیتی ہے کہ زیر بحث مسئلے کا معروضی جائزہ لے، معروضی تجزیے کی یہ روش، مسئلے کے متعلق درست زاویے سے سوال اُٹھانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، ہماری رائے میں کسی مسئلے کے قابل قبول حل کے لئے پہلا قدم، اس کے متعلق درست سوال اُٹھانا ہے، ملاحظہ کیجئے کہ خالد سیف اللہ صاحب نے آج کے ایک سنجیدہ مسئلے کو کتنے معروضیت پسندانہ اُسلوب سے اڈریس کیا ہے :

> سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یا کم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے تو اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کردینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انھیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے؟ تاکہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے

سے بچاسکیں، اصل مسئلہ (Child marriage) کا نہیں؛ بلکہ (Child Sex) کا ہے۔ (کم عمری کی شادی، ج:۱، ح:۲، ص:۱۶۴)

خالد سیف اللہ صاحب کی سوچ کے اسی رُخ نے انھیں ایسے خود ساختہ بے جان مسائل میں اُلجھنے نہیں دیا، جن کا سماجی نشو ونما سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا؛ بلکہ ہوا یوں ہے کہ موصوف نے دین اسلام کی اصل روح پر مسلسل نظر رکھتے ہوئے ایسے زندہ معاشرتی مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، جن کی بابت مسلم سماج میں بہت زیادہ حساسیت پائی جانی چاہئے:

کون صاحبِ دل ہے، جسے بچہ کی معصوم مسکراہٹ اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو اور اس کا رونا اور بلکنا سخت سے سخت انسان کو بھی تڑپا نہ دیتا ہو؟ بچہ خواہ خوش رنگ ہو یا کالا کلوٹا، صاف ستھرا ہو یا میلا کچیلا، کسی کاشانہ عشرت میں پیدا ہوا ہو یا آشیانہ غربت میں، اس کا بچپن کشش سے بھر پور ہوتا ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی حساس اور فطرتِ سلیمہ کا حامل اسے دیکھے اور دل بھر نہ آئے اور ماں باپ اور خاندان کے اہل تعلق کا کیا کہنا، ان کو تو اپنے بچوں کے معصوم چہرہ میں لالہ وگل کا نکھار اور غنچہ وگل کی بوئے عطر بار کا احساس ہوتا ہے...... بچوں کو کسبِ زر کا ذریعہ بنانا اور تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا بڑی بے رحمی اور بدخواہی ہے؛ کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کو معاشی، اخلاقی اور فکری اعتبار سے پس ماندہ اور محروم رکھنے کے مترادف ہے، اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ کم عمر بچوں کو کسبِ معاش کا مکلّف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ کما نہ پائیں گے تو چوری کا ارتکاب کریں گے ...... کوئی غریب شخص معذور ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے اور گھر میں کوئی کمانے والا موجود نہ ہو تو دکھیاری بیوہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ اپنے کم عمر نونہالوں کو مشقت کی اس بھٹی میں ڈال کر چند پیسے حاصل کرے، اسی سے اپنا تن ڈھانکے، پیٹ بھرے، اپنی اور گھر کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے، سماج اتنا ظالم اور خود غرض ہے کہ وہ کسی غریب کی جھونپڑی پر ترچھی نظر ڈالنے کو بھی تیار نہیں ہوتا اور مجبوری کو دیکھ کر اس کی رہی سہی پونجی بٹورنے بلکہ بعض اوقات اس کی عزت وآبرو کا بھی سودا کرنے کو کمر بستہ ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر ان بے کس وبے آسرا لوگوں کو بچہ مزدوری کے سلسلہ میں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا، شریعت کا اُصول یہی ہے کہ اگر دو خرابیوں میں سے ایک کے ارتکاب پر مجبور

> ہوجائے تو کم تر درجہ کی برائی اختیار کر لے...... یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت محنت ومزدوری کے معاملہ میں پندرہ سال کے لڑکے کو بالغ تصور کرتی ہے؛ لیکن نکاح وغیرہ میں نابالغ ۔ (بچہ مزدوری-اسلامی نقطۂ نظر، ج:۱، ح:۳،ص:۶۵-۷۰)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خالد صاحب نے این جی اوز کے مانند محض فنڈز بٹورنے کے لئے بچہ مزدوری کو (Highlight) نہیں کیا؛ بلکہ اسلامی حوالہ دیتے ہوئے جیتے جاگتے سماج کے تکلیف دہ حقائق کو پیش نظر رکھا ہے اوراس کے علاوہ جدید حکومتوں کی دوغلی پالیسی کو بھی بے نقاب کیا ہے جو وہ نام نہاد انسان دوستی کے نام پر اپنائے ہوئے ہیں، مذکورہ اقتباس کا آخری فقرہ صدا لگا رہا ہے کہ غیر حقیقت پسندانہ پالیساں، ذمہ داری سے فرار کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

جدید مغربی سماج میں بڑھاپا ایک بڑا مسئلہ ہے، وہاں اولڈ ہومز بھی ہیں اور والدین کے خصوصی دن بھی منائے جاتے ہیں، اب جدیدیت کا سیلاب، مشرقی سماج کا رُخ کئے ہوئے ہے، اگر چہ اس کے مضر اثرات ابھی بہت واضح نہیں ہیں؛ لیکن خالد سیف اللہ صاحب، خطرے کی بو سونگھ چکے ہیں، اس لئے انھوں نے اس مسئلے پر بھی قلم اُٹھایا ہے :

> جوانی کا زمانہ طاقت کے عروج اور صلاحیتوں کے کمال کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں آدمی کے لئے یہ سوچنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ پھر کبھی کمزوری اس پر اپنا سایہ ڈال سکے گی، چلتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑائیں گے، بینائی اس کا ساتھ چھوڑ دے گی اور جسم کی ایک ایک صلاحیت دامن وفا چھوڑ کر رُخصت ہوجائے گی؛ لیکن آخر ہوتا وہی ہے جس سے انسان بھاگنا چاہتا ہے، جوانی رخصت ہوتی ہے اور بڑھاپا اپنی پوری شان کے ساتھ سایہ فگن ہوجاتا ہے، اب آنکھوں پر موٹے چشمے ہیں، چہروں پر جھریاں ہیں، ہاتھوں میں عصا ہے، قدموں میں لرزہ ہے، حافظہ اور یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ رکھا ہے، منھ دانت سے خالی ہے اور آواز ایسی ہے کہ بازو کا آدمی بھی بات سمجھ نہیں پاتا ہے، اس منزل کے بعد قبر ہی کی منزل ہے، انسان بچپن میں بھی محتاج اور عجز و ناطاقتی کا نمونہ ہوتا ہے اور بڑھاپے میں بھی، لیکن بڑھاپے میں یقیناً مجبوری کا احساس زیادہ ستاتا ہوگا، جوانی کے ایک ایک قصے یاد آتے ہوں گے اور اشکِ افسوس سے ڈاڑھی تر ہوتی ہوگی......پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ تم لوگوں کو ضعف اور کمزوری کی ہی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے، یہ بڑی اہم بات ہے، آدمی ایسے بوڑھے اور معذور

لوگوں کو اسی لئے تو بوجھ سمجھتا ہے کہ وہ صرف کھاتے ہیں کچھ لاتے نہیں ہیں، ان کے پاس کھانے والے ہاتھ ہیں کمانے والے ہاتھ نہیں، آپ ﷺ نے اس تصور ہی کی جڑ کو کاٹ دیا...... بڑھاپے کی نفسیات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس عمر میں انسان چاہتا ہے کہ اس کے چھوٹے اس کے ساتھ عزت وتوقیر کا معاملہ کریں، اس کو سماج میں بہتر مقام دیا جائے، آپ نے اس کا بھی پاس ولحاظ فرمایا ہے، ایک سن رسیدہ شخص آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا، لوگوں نے جگہ دینے میں دیر کی تو آپ نے تنبیہ کی اور فرمایا کہ جو شخص چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جو بڑوں کا مقام نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں، حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کی اس کی عمر کی رعایت کرتے ہوئے تعظیم کرے گا تو جب وہ نوجوان اس عمر کو پہنچے گا تو اللہ اس کے لئے بھی ویسا ہی تعظیم کرنے والا مہیا کردیں گے۔ (بوڑھے اور ہمارا سماج، ج:۲، ح:۴، ص:۷۸-۸۱)

انسانی نفسیات کی گہرائیوں کی گرہ کشائی اور پھر اسے سماجی حقیقت نگاری میں ڈھالنا آسان کام نہیں، خاص طور پر کسی مولوی سے اس کی توقع ہی عبث ہے؛ لیکن ہمارے ممدوح نے کمال دیانت سے یہ مشکل فریضہ سرانجام دیا ہے:

جب انسان کسی معاملہ کو اپنے اور دوسرے کے درمیان رکھ کر سوچتا ہے تو غصہ بڑھتا ہے اور انتقام کی چنگاری شعلہ بن جاتی ہے اور وہی شخص جب اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان خدا کو رکھ کر سوچتا ہے تو غضب کی آگ محبت کی شبنم میں تبدیل ہوجاتی ہے اور معاف کرنا نہ صرف آسان ہوجاتا ہے؛ بلکہ اس میں ایک لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ (بخش دو گر خطا کرے کوئی، ج:۲، ح:۴، ص:۴۳)

بعض لوگ طبعاً بُرے نہیں ہوتے؛ لیکن ان کی طبیعت میں مبالغہ ہوتا ہے، وہ لفظوں کے ایسے بازی گر ہوتے ہیں کہ سننے والے کو رائی کا پہاڑ محسوس ہوتا ہے، کچھ لوگ شریف اور نیک خو ہوتے ہیں؛ لیکن سادہ لوح اور بھولے بھالے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی باتوں کا یقین کرلیتے ہیں، کسی خبر پر جرح نہیں کرتے اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھے بغیر مان لیتے ہیں، بعض حضرات سے کسی بات کو سننے

یا سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہوجاتی ہے ، یہ مختلف اسباب ہیں ، جن کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ اور بالا رادہ یا بلا ارادہ خلافِ واقعہ باتیں لوگوں میں چل پڑتی ہیں، ایسی ہی بے سروپا باتوں کو 'ہوا' کہتے ہیں۔ (افواہیں اور ہمارے رویہ، ج:۲، ح:۴، ص:۴۳)

بعض لوگ بدزبان اور بدمزاج ہوتے ہیں، معمولی باتوں پر برہمی اور اپنے بزرگوں اور سماج کے باعزت لوگوں پر حرف گیری کا مزاج رکھتے ہیں، جس کو جو جی میں آیا کہہ دیا؛ بلکہ موقع ہوا تو دشنام طرازی سے بھی نہیں چوکتے ، پھر اسے فخریہ بیان کرتے ہیں ، اسے اپنا کمال سمجھتے ہیں ، یا اسے صاف گوئی کا عنوان دیتے ہیں ، حالاں کہ صاف گوئی کے معنی دوسروں پر طنز وتعریض یا تنقیص نہیں اور اپنی نازیبا باتوں پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو کھری کھری سنائی اور فلاں شخص کو برسرعام ایسا اور ویسا کہا، حالاں کہ یہ سب قابل شرم باتیں ہیں نہ کہ قابل فخر، ان پر انسان کو شرمانا چاہئے نہ کہ اترانا۔ (گناہ پر فخر، ج:۱، ح:۱، ص:۱۹۲)

ضرورت اس بات کی ہے کہ خودکشی کے اخلاقی اور سماجی نقصانات لوگوں کو بتائے جائیں، سماج میں لوگوں کی تربیت کی جائے کہ وہ تنگ دستوں اور مقروضوں کے ساتھ نرمی اور تعاون کا سلوک کریں، گھر اور خاندان میں محبت اور پیار کی فضا قائم کریں اور باہر سے آنے والی بہو کو محبت کا تحفہ دیں، رسم ورواج کی جن زنجیروں نے سماج کو زخمی کیا ہوا ہے ان کو کاٹنے کی کوشش کریں، شادی بیاہ کے مرحلوں کو آسان بنائیں اور جو لوگ ذہنی تناؤ سے دوچار ہوں اور مشکلات سے گھرے ہوئے ہوں، ان میں جینے اور مسائل ومشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کریں، کہ بقولِ حضرت کلیم :

سلگنا اور شئے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ پروانوں سے کیا ہوگا

اسلامی اخلاقی اقدار کا جدید طرزِ زندگی پر اطلاق، سماجی اجتہاد کا تقاضا کرتا ہے، جس سے ایک طرف ان اقدار کی نئی معنویت، انھیں سول سوسائٹی سے (Relate) کرتی ہے اور دوسری طرف جدید زندگی کے مضر پہلو، شعوری طور پر ناپسندیدہ قرار پاتے ہیں، خالد صاحب کی تحریر میں یہ وصف بہت نمایاں ہے، دیکھئے ذرا :

جب آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں تو سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں جو اوقاتِ کار متعین ہوں، آپ ان اوقات میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنے کا عہد کرتے ہیں، اگر

آپ ان اوقات کی پابندی نہ کریں، دفتر دیر سے پہنچیں، پہلے دفتر سے نکل جائیں، یا درمیان میں دفتر چھوڑ دیں، یا دفتر کے اوقات میں مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بجائے اپنے ذاتی کام کرنے لگیں تو یہ بھی وعدہ کی خلاف ورزی میں شامل ہے، بعض شعبوں میں ملازمین کو خصوصی الاؤنس دیا جاتا ہے کہ وہ پرائیوٹ طور پر کوئی اور کام نہ کریں، خاص کر میڈیکل شعبہ میں گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی پوری صلاحیت سرکاری دواخانے میں آنے والے مریضوں پر خرچ ہو؛ کیوں کہ انسان کی قوتِ کار محدود ہے اور جو شخص ہسپتال میں آنے سے پہلے اپنی قوت ڈھیر سارے مریضوں کو دیکھنے میں صرف کر چکا ہو، یقیناً اب جو مریض اس کے سامنے آئیں گے، وہ کما حقہ اس کی تشخیص نہیں کر سکے گا ...... وعدہ کا تعلق ہماری تقریبات، جلسوں اور دعوتوں سے بھی ہے، مثلاً دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ نکاح عصر کے بعد ہوگا؛ لیکن جب تقریب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب اپنی شانِ خاص کے ساتھ عشا کے بعد تشریف لائے ......غور کیجئے کہ لوگ ایسی تقریبات میں شرکت اپنے تعلقات کی پاس داری میں کرتے ہیں کسی کے یہاں بیماری ہے، کوئی خود بیمار ہے، کسی نے تقریب کے وقت کے لحاظ سے آئندہ پروگرام بنا رکھا ہے، ایسے مواقع پر یہ تاخیر اس کے لئے کس قدر گراں گزرتی ہے، آکر واپس ہونے میں بھی ہم اس کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے۔ (وعدہ خلافی – ہمارے سماج میں، ج:۲، ح:۴، ص:۱۷۰-۱۷۲)

مذہبی حدود کے خاص دائرے سے باہر انسانی زندگی کے کئی ایسے پہلو ہیں جہاں اسلام نے خاموشی اختیار کی ہے، خالد صاحب کے نزدیک یہ خاموشی انسانی اختیار کے اثبات کے اعتبار سے دین ہی کا حصہ ہے :

شرعاً ایک مسلمان کے لئے صرف یہ رعایت ضروری ہے کہ بیت الخلا کی نشست ایسی ہو کہ قضائے حاجت کرتے ہوئے چہرہ یا پشت قبلہ کی سمت نہ پڑے اور بس، مکان کے سلسلہ میں اس کے علاوہ انجینئر سے مشورہ کرنا چاہئے کہ مکان کس طرح کا ہو کہ ہوا اور روشنی پوری طرح بہم پہنچے؛ لیکن اس کا مشورہ بھی پنڈت سے کیا جاتا ہے جو محض چند پیسوں کے لئے لوگوں کو اوہام میں گرفتار رکھنا چاہتا ہے، یہ تمام باتیں محض ایمان کی کمزوری اور ضعف عقیدہ کا نتیجہ ہیں، حد یہ ہے کہ اب بعض مسلمان بھی عقدِ نکاح کے وقت اور شادی کے جوڑوں کے سلسلہ میں عاملین سے مشورہ لیتے ہیں،

گویا جس غلامی سے اسلام نے اسے آزاد کیا تھا خود ہی اپنے آپ اس میں مبتلا ہوتے ہیں ۔(اوہام پرستی اور اسلام، ج:۲، ح:۴، ص:۲۴)

خالدسیف اللہ صاحب رحمانی، انسانی اختیار کی بے توقیری اوراس اختیار کے مذہبی لوگوں کے ہاں یرغمال بنائے جانے پرشکایت کناں ہیں، وہ مسلمانوں کو یاددلاتے ہیں اور غیر مسلموں کو باور کراتے ہیں کہ :

اگر پیغمبر اسلام کا منشا اسلام کو تھوپنا ہوتا تو نہ مدینے میں کوئی یہودی باقی رہتا اور نہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں کوئی مشرک ، اسلام کی آمد سے پہلے یہ مزاج تھا کہ سلطنت کا جو مذہب ہوتا تمام لوگ اسی مذہب کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرنے کے پابند ہوتے ، اسی لئے روم میں کوئی مشرک اقلیت تھی نہ ایران میں اہل کتاب کا کوئی گروہ تھا۔ (فاصلے کیوں کر گھٹیں گے؟ ج:۱، ح:۲، ص:۱۳۶)

جب بادشاہ کے تاج کی قیمت لاکھوں ڈالر ہوتی تھی اور غریب کسان گراں بار ٹیکسوں کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلات کی پناہ لینے پر مجبور تھے، ان حالات میں مسلمان ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے ان ملکوں میں پہنچے اور انھوں نے بے جان زمینوں پر قبضہ کرنے سے زیادہ لوگوں کے قلوب کو فتح کرنے کی کوشش کی ، مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت زندگی گزارنے کی راہ یہی ہے کہ وہ نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئیں اور نقشِ دیوار پڑھ کر اپنے لئے ایک ایسا منصوبہ بنائیں جو دیر سے سہی ؛ لیکن منزل مقصود کو پہنچاتا ہو اور محض حقیر اور وقتی مفادات پیش نظر نہ ہوں ۔(ایک اہم فریضہ جس سے ہم غافل ہیں، ج:۱، ح:۱، ص:۳۱۴)

یہ ایک اچھا خواب ہے کہ اسلاف کی طرز پر مسلمان آج پھر نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئیں؛ لیکن آج کی عالمگیریت کی فضا میں نجات کا کوئی ایسا فارمولہ جو ہندوستان یا کسی بھی ملک کی علاقائی حدود کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو، مطلوبہ مقاصد نہیں دے سکتا، موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نے آکٹوپس کی طرح حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کو انتہائی شدت سے جکڑا ہوا ہے، اس کے خاتمے اور متبادل نظام کے لئے عالمی سطح پر نہایت سنجیدگی سے ہوم ورک کرنے کی ضرورت ہے، افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مذہبی حلقے میں متبادل نظام دینے کی سنجیدہ سوچ تک نہیں پائی جاتی ، ایسے گئے گزرے دور میں جب کہ سماجی اخلاقیات کا بھی جنازہ نکل چکا ہے اور یار لوگ اسے قصہ پارینہ خیال کرتے ہیں، حتیٰ کہ ایسے 'سمجھ دار' لوگوں کی بھی کمی نہیں، جو سماجی اخلاقیات کے کلاسیکی تصور کو زرعی دور سے مخصوص قرار دیتے ہیں، خالد سیف اللہ رحمانی نے سرمایہ داری کے فولادی خول میں چھید ڈالنے کی

خاطر، واشگاف الفاظ میں کئی مقامات پرصدائے احتجاج بلند کی ہے اور انسانی اجتماعی زندگی کے سب سے بڑے محور ریاست اور اس سے متعلق اُمور میں اخلاقی اقدار کی بازیافت کی بات چلائی ہے :

> عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی ایسے اُمیدوار کو ووٹ دیا ہو جو کامیاب ہوا ہے تو اسے اپنی فتح سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ اُمیدواروں کی شکست و فتح تو ہوسکتی ہے ووٹروں کی شکست و فتح نہیں ہوسکتی، اگر آپ نے کسی اُمیدوار کو دیانت داری کے ساتھ موزوں اُمیدوار سمجھ کر ووٹ دیا ہے تو گو وہ شکست کھا جائے پھر بھی آپ کی فتح ہے کہ شرعاً آپ جس بات کے مکلّف تھے آپ نے اسے پورا کر دیا اور اگر آپ کا ووٹ فتح یاب اُمیدوار کے حق میں گیا؛ لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے یا آپ نے کوئی مفاد حاصل کر کے ووٹ دیا اور گویا رشوت لے کر مستحق یا غیر مستحق شخص کے حق میں اپنے حق رائے دہی کو استعمال کیا تو اُمیدوار کے جیتنے کے باوجود آپ نے شکست کھائی ہے اور آپ نے پایا نہیں ہے؛ بلکہ کھویا ہے کیوں کہ آپ ایک فعل گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس کی کوتاہ کاریوں میں عنداللہ آپ شریک سمجھے جائیں گے، کتنی گھبرا دینے والی ہے یہ بات اور کتنا تشویش انگیز ہے، الیکشن کا شرعی پہلو!۔(ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے!ج:۲،ح:۴،ص:۶۵)

انسانی زندگی میں سماجی اخلاقیات کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دینے کے باوجود ہمارے ممدوح خرافاتی صوفی مشرب میں رنگے ہوئے نہیں ہیں، ان کا ذہن اور مزاج، منطقی اور استدلالی آہنگ لئے ہوئے ہے، اس مخصوص ذہنی سانچے کی بدولت وہ فکرِ اسلامی کی ثقاہت پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے اسالیب میں اس کی توجیہ کی بھی کامیاب کوشش کرتے ہیں :

> ایک صاحب اتنے غضب ناک تھے کہ لگتا تھا کہ اب ان کی ناک پھٹ پڑے گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ کہے تو اس کا غصہ فرو ہو جائے، دریافت کیا گیا کہ وہ کیا کلمہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**أعوذ بالله من الشيطن الرجيم**'' (ابوداود، بخاری) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غصہ ایک شیطانی حرکت ہے، جب انسان اس موقع پر تعوذ پڑھے گا تو اللہ کی مدد سے اس شیطانی حرکت پر غلبہ پالے گا، نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کلمہ کو پڑھتے ہوئے آدمی کا ذہن اس جانب منتقل ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شیطان کا آلہ کار ہے، اس خیال سے وہ اپنے آپ کو موجودہ کیفیت سے بآسانی نکال سکے گا۔(سب سے بڑی بہادری، ج:۲، ح:۴، ص:۱۰۹)

خالد صاحب کی مذکورہ نکتہ طرازی مسلم سماج سے تقاضا کرتی ہے کہ اس کے افراد قرآن وحدیث کے ساتھ لفظی تعلق سے بڑھ کر معنوی آشنائی کا سنگِ میل عبور کر کے اس کی حقیقی روح سے شناسا ہوں، ہماری رائے میں یہ کوئی غیر دانشمندانہ یا احمقانہ تقاضا نہیں؛ بلکہ حقیقی سماجی انقلاب برپا کرنے کا واحد حتمی ذریعہ ہے، اس سلسلے میں دین اسلام کے بنیادی ماخذ قرآن مجید کے الفاظ سے کہیں بڑھ کر، اس کی تفہیم پر دلالت کناں سبعہ احرف روایت، روشنی کا مینارہ معلوم ہوتی ہے۔

اس وقت مسلم دنیا کے سنجیدہ دانشور مسلمانوں کی تکنیکی پس ماندگی سے بہت زیادہ خائف نہیں ہیں، جو خدشہ انھیں بے چین کئے رکھتا ہے، اس کا تعلق مسلم سماج کی اخلاقی گراوٹ سے ہے کہ آج کے مسلمان اپنے روایتی امتیازی کردار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، اب ان کے ہاں ان کے اسلاف کی سی للّٰہیت نہیں رہی؛ لیکن ہمارے محترم مؤلف نے اپنا ایک ذاتی واقعہ نقل کر کے اُمید بندھائی ہے کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، آج بھی غیروں کی نظر میں مسلم کردار کی وہی آن شان ہے جو ہمیشہ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ غیروں کا ایسا اعتراف کسی ہم دردی کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ امرِ واقعہ کا بیان یا کسی حقیقت کا ترجمان ہی ہوسکتا ہے، واقعہ پڑھئے اور سر دُھنئے:

> کئی سال پہلے کی بات ہے، میں دہلی سے حیدرآباد آرہا تھا...... کیبن میں تین برتھ تھے، دہلی سے ہم دو ہی آدمی اس کیبن میں سوار ہوئے، ایک طرف میں اور طرف میرے ہی ہم عمر ایک مسافر جو سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھے، اس کی پیشانی پر سرخ وسفید قشقے ہندو مذہب پر اس کے ایقان اور اس کی مذہبیت کو ظاہر کر رہے تھے، گاڑی جب بھوپال پہنچی تو ایک ہندو فیملی آئی، ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی جس کی عمر اُٹھارہ بیس سال رہی ہوگی، یہ لوگ اصل میں ناگپور کے رہنے والے تھے اور کسی ضروری امر کے تحت لڑکی کو اچانک بھیج رہے تھے، لمبا راستہ اور ایک تنہا لڑکی کا سفر، اس سے وہ لوگ پریشان تھے...... حالاں کہ وہ ہندو بھائی میرے سامنے ہی بیٹھے تھے اور میری شکل وصورت سے ان کے لئے یہ پہچاننا بالکل دشوار نہیں تھا کہ میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ایک مولوی واقع ہوا ہوں، اس کے باوجود ہماری طرف مخاطب ہوئے اور کہنے لگے: ''مولانا صاحب! اسے ناگپور جانا ہے، یہ اب آپ کی لڑکی ہے اور ہم اسے آپ کے حوالہ کر رہے ہیں'' ...... یہ لڑکی طالبہ تھی...... اسلام میں خواتین کا کیا درجہ ومقام ہے، اس بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کردی...... اس نے مجھ سے بار بار اشتعال انگیز اور غصہ دلانے والے سوالات کئے؛ لیکن میں نے ہمیشہ تحمل اور صبر کے

> ساتھ جواب دیا، اس بات نے اسے خاص طور سے متاثر کیا اور کہنے لگی کہ کیا آپ کو غصہ آتا ہی نہیں ہے؟ میں نے اسے حضور ﷺ کی وہ حدیث سنائی جس میں بار بار آپ سے جینے کا طریقہ دریافت کیا گیا اور آپ نے ہر بار ایک ہی بات ارشاد فرمائی کہ غصہ نہ کرو''لا تغضب'' جب ٹرین ناگپور پہنچی تو اس کے ماموں وغیرہ پلیٹ فارم پر موجود تھے......اصل میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا، وہ یہ کہ اس کیبن میں میرے برابر ہی ایک ہندو شخص موجود تھا اور اپنی ہندو پہچان کے ساتھ تھا، نیز اسے بھی حیدرآباد آنا تھا، انسان کے لئے عزت وآبرو کا مسئلہ جان و مال سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے؛ لیکن بہ مقابلہ اس غیر مسلم کے ہندوستان میں ہندو فکر کے سب سے بڑے مرکز ناگپور کے ہندوؤں نے ایک مسلمان مولوی پر زیادہ اعتماد کیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور حاملین اسلام کے بارے میں سماج کیا سوچتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ سوچ تجربات پر مبنی ہوتی ہے۔ (پروپیگنڈہ کا جواب عمل سے، ج:۱، ح:۱، ص:۲۹۴-۲۹۶)

مسلم کردار کی ایسی مثبت شناخت، بلا شبہ قابل اطمینان اور تسلی بخش ہے؛ لیکن خالد صاحب اس پر قانع ہوتے نظر نہیں آتے، ان کی دور بین نگاہیں مسلم کردار کے ان پہلوؤں کا بھی تنقیدی جائزہ لے رہی ہیں، جو ہماری ترجیحات میں کبھی شامل نہیں رہے، اگر چہ بعض این جی اوز فیشن کے طور پر ان عنوانات کے تحت فنڈ جمع کرتی رہتی ہیں؛ لیکن جس سنجیدگی سے اس مسئلہ کو لیا جانا چاہئے، وہ سنجیدگی عملاً مفقود رہی ہے، ملاحظہ کیجئے کہ ہمارے ممدوح نے اُسوۂ رسول ﷺ سے راہنمائی لیتے ہوئے ایک انتہائی اہم لیکن ہماری نگاہوں سے اوجھل مسئلے پر کتنے موثر انداز میں خامہ فرسائی کی ہے :

> رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کو ایک فوجی مہم پر روانہ کیا، یہ حضرات گئے، مقابلہ بھی بہادری کے ساتھ کیا؛ لیکن مقابلہ میں جم نہ سکے اور راہِ فرار اختیار کرنی پڑی، جب مدینہ واپس آئے تو مارے شرم کے چھپے پھرتے تھے اور آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے، کہتے تھے کہ ہم تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں......آپ نے محسوس کیا یہ موقع زجر و توبیخ اور شرمساروں کو مزید شرمسار کرنے کا نہیں؛ بلکہ ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے کا ہے، آپ نے لطف وکرم کا لب ولہجہ اختیار کیا اور فرمایا کہ تم بھاگے نہیں؛ بلکہ تم اس لئے پیچھے ہٹے ہو کہ پیچھے آکر دوبارہ حملہ کرو، تم نے اس لئے پسپائی اختیار کی ہے کہ نئی کمک ساتھ لے کر مقابلہ پر اُترو...... ملک میں جہاں مسلمانوں نے بہت

سے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، وہیں ایک ایسے ادارہ یا ٹیم کی بھی ضرورت ہے جو مختلف میدانوں میں ان لوگوں کی اخلاقی مدد کرے اور حوصلہ افزا مشورے دے، جن کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور وہ پست حوصلگی کے باعث میدانِ مسابقت چھوڑنے لگیں، کتنے ہی مسلمان طلبہ ہیں جو ساتویں جماعت کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں؛ لیکن جماعت دہم تک نہیں پہنچ پاتے، کتنے مسلمان تاجر ہیں جو اُبھرتے ہیں؛ لیکن کسی وقتی واقعہ کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے اس میدان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، یہی حال ہر شعبہ زندگی کا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو ہمت دلائی جائے اور ان کو اپنا سفر جاری رکھنے پر آمادہ کیا جائے...... کہ شکست کے احساس اور پست ہمتی کے ساتھ کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ (تم صرف پیچھے ہٹے ہو، ج:۱، ح:۱، ص:۲۲۰-۲۲۳)

خالد سیف اللہ صاحب نے پست ہمتی کی مذکورہ نوعیت سے ایک قدرے مختلف نوع پر بھی قلم اُٹھایا ہے، اسے اجتماعی پست ہمتی کا نام دیا جا سکتا ہے، جس کے پیچھے صبر کی کمی اور عجلت جیسی خامیاں کارفرما ہیں :

جیسے جسمانی سطح پر الرجی انسان کو کمزور کر دیتی ہے اور اس کی معتدل کیفیت کو زیروزبر کر کے رکھ دیتی ہے، اسی طرح قومیں بھی ''الرجی'' سے دوچار ہوتی ہیں، بعض قوموں اور گروہوں میں برداشت کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور ردِعمل کی کیفیت بڑھ جاتی ہے، وہ بات بات پر مشتعل ہوتے ہیں، مخالفین کا ایک بیان مہینوں ان کو اُلجھا کر رکھ دیتا ہے، اور بے برداشت ہونے کی وجہ سے ایسی جذباتیت کا ان سے مظاہرہ ہوتا ہے جس کا نقصان خود ان کو پہنچتا ہے، ایسی قومیں دشمنوں اور بدخواہوں کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے حقیقی مسائل کی طرف توجہ نہیں دے پاتیں، ہمیشہ ردِعمل میں اُلجھی رہتی ہیں، دوسری قومیں تعلیمی، معاشی اور دوسرے پہلوؤں سے آگے بڑھتی رہتی ہیں اور یہ سنہرا وقت مشتعل مزاج قوم، ماتم وزاری اور سینہ کوبی میں گزار دیتی ہیں، ہندوستان میں مسلمان اس وقت ان ہی حالات سے گزر رہے ہیں، ہم ایک طرح کی قومی الرجی میں مبتلا ہیں، ہمیں مشتعل کرنے کے لئے بے بنیاد افواہیں بھی کافی ہیں...... حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص مال یا جان کے معاملہ میں آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے اور لوگوں سے اس کا شکوہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ اسے معاف کر دے، جیسے یہ بات افراد کے بارے

میں کہی جاسکتی ہے، یہی بات قوموں اور گروہوں کے بارے میں کہی جائے تو بے جا نہ ہو، کہ جو قوم دوسروں کے سامنے کاسہ گدائی لے کر کھڑی رہے اور محض ناانصافی کا رونا روتی رہے وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور جو قوم اللہ پر بھروسہ کرکے ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتی جائے، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے اور اللہ کی رحمت اس پر سایہ فگن رہتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے امن اور ہدایت ہے، یعنی صبر کی وجہ سے امن وامان کی حالت رہتی ہے اور وہ صحیح راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ (صبر-خوش تدبیری ہے نہ کہ بزدلی، ج:۲، ح:۴، ص:۴۵-۴۹)

حیرت ہے کہ 'راہِ عمل' کی دونوں جلدوں میں ہمیں 'یہود وہنود' کی مقبول عام ترکیب کہیں نہیں ملی؛ البتہ یہود ونصاریٰ سے سابقہ ضرور پڑا ہے، بہت سامنے کی بات ہے کہ خالد سیف اللہ صاحب کا فہم دین، ہندوستان میں جمہوری نظام اور ہندو اکثریت کے خمیر سے اُٹھا ہے اور پاکستان کے علماء کا فہم دین، داخلی اعتبار سے فروعی مسائل کے غلغلوں اور خارجی لحاظ سے یہود وہنود کی ریشہ دوانیوں سے نشو ونما پایا ہے، کسی غیر جانب دار مبصر کے لئے اکیسویں صدی کے گلوبل ولیج میں فہم دین کے اس قسم کے مختلف النوع دھارے قابل قبول نہیں ہوسکتے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین اپنی اصالت میں اضافی ہے کہ زماں کے اشتراک کے باوجود محض مکاں کی تبدیلی سے دین کے ظہور کی صورتیں ہی بدل جائیں؟ خاص طور پر ایسے دور میں جب مکاں کی تبدیلی کی اہمیت بہت ہی کم ہوچکی ہو، بہر حال! خالد سیف اللہ صاحب کا فہم دین، آج کی دنیا سے کافی لگا ؤ کھاتا ہے، وہ آنکھیں کھول کر آج کی دنیا میں سانس لینا چاہتے ہیں، اس لئے ان کے ہاں پٹے پٹائے موضوعات نہیں؛ بلکہ ان کے قلم نے نئی دنیا کے نئے مسائل کو للکارا ہے، چند عنوانات ہی دیکھئے: ''مردم شماری میں حصہ لینا-ایک اہم دینی فریضہ، ٹریفک-شرعی ہدایات، ٹیلی فون-احکام وآداب، کھیل-آداب واحکام، میچ فکسنگ-مرض اور علاج، ووٹ-اسلامی نقطۂ نظر، ووٹ-ایک امانت، مرض اور مریض-اسلامی تصور، جانور اور اسلامی تعلیمات، ایڈس-حقیقی حل کیا ہے، ماحولیاتی آلودگی اور اسلام، نیوکلیر اسلحہ-اسلامی تصور، مزدوروں کے حقوق، کلوننگ-اسلامی نقطۂ نظر'' وغیرہ وغیرہ، پھر ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف موضوعات کی حد تک جدید دنیا کو چھوا ہے اور زبان وبیان اور اُسلوب میں فرسودگی اختیار کی ہے؛ بلکہ ان کا اصل کمال یہی ہے کہ انھوں نے ''گلوبل ولیج کے مخاطب'' کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت کا پورا دھیان رکھا ہے جو دھونس زبردستی کے بجائے مکالمے کی فضا میں بات کرنا چاہتا ہے، اسی لئے خالد صاحب اکثر مواقع پر اپنا موقف بیان کرنے سے قبل مخاطب کے مطلب کی بات کرتے ہیں، یعنی ایک طرح سے اس کی بات سنتے ہیں، بات سنے جانے

کے احساس سے مخاطب کا ایک حد تک تزکیہ ہوجاتا ہے جس سے اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے کہ وہ خالد صاحب کے نکتے کو سمجھنے کی کم از کم کوشش ضرور کرے، مثال کے طور پر (مجسمہ کا انہدام-غور وفکر کے چند پہلو، ج:۱، ح:۲ص:۸۵) پڑھ لیجئے۔

زیرِنظر تالیف کے کئی گرانقدر پہلو قارئین کی ضیافت کا سامان لئے ہوئے ہیں؛ لیکن ہم اختتامی کلمات کی طرف بڑھتے ہوئے کتاب کے ظاہری حسن کی بابت عرض کریں گے کہ ایک تو جاذبِ نظر کے بجائے انتہائی خستہ کاغذ پر طبع، اس کی دونوں جلدوں کی ضخامت یکساں نہیں ہے، انیس بیس کا فرق قابل لحاظ ہوتا؛ لیکن یہاں تو فرق تقریباً سو فیصد کا ہے، پہلی جلد کے صفحات ۸۴۸ اور دوسری کے ۴۸۴ ہیں، اس لئے ظاہری اعتبار سے دوسری جلد، پہلی کا تتمہ معلوم ہوتی ہے، پھر اس بدنمائی میں سونے پر سہاگہ، اس کتاب کی عجیب وغریب ترتیب ہے، پرانے طرز پر صفحات نمبر کے تسلسل کے بغیر پانچ مختلف تالیفات کو دوجلدوں میں اس طرح سمویا گیا ہے کہ 'گھس بیٹھیوں' کا گمان ہوتا ہے، جب عکس لے کر کتاب شائع کی جائے تو ایسی غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں، سرورق میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے، اگر نبی خاتم ﷺ کی مہر مبارک کا عکس چھاپنا ہے تو اسے اوپر کونے میں جہاں 'راہِ عمل' پرنٹ ہے، شائع کیا جائے کہ احترام کا تقاضا یہی ہے، خالد سیف اللہ صاحب نے خود بھی (دستخط-اسلامی احکام، ج:۱، ح:۳ص:۲۰۸) اس احترام کی طرف توجہ دلائی ہے :

> آپ ﷺ نے شاہانِ عجم اور روسائے عرب کو دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا، اس موقع سے بعض حضرات نے آپ سے عرض کیا کہ یہ حضرات مہر کے بغیر خطوط کو قبول نہیں کرتے؛ چنانچہ آپ نے مہر بنوائی جس پر 'محمد رسول اللہ' کندہ کیا گیا اور آپ نے کمالِ احترام کا لحاظ کرتے ہوئے نیچے ''محمد'' اس کے اوپر ''رسول'' اور سب سے اوپر ''اللہ'' کے کلمات لکھے۔

املا کی اغلاط کے انبار نے، جو درحقیقت پروف ریڈنگ میں روا رکھی گئی، انتہائی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے، 'راہِ عمل' کو ایک خاص پہلو سے بے عمل بھول بھلیوں کا روپ دے دیا ہے، ظاہری تزئین میں مانع اس خامی نے، کتاب کے بامقصد مواد میں مضمر حقانیت کو بری طرح تو مجروح نہیں کیا؛ لیکن خاطر خواہ حد تک برا تاثر ضرور پیدا کیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اس خامی کے ذمہ دار ہمارے ممدوح مؤلف نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا 'سہرا' صرف اور صرف پبلشرز کے سر بندھتا ہے، املا کی اغلاط کے علاوہ تاریخوں اور حوالہ جات کے غلط اندراج سے بدنمائی میں مزید اضافہ ہوا ہے (اسی لئے ہم نے اقتباسات میں حوالہ دینے سے دانستہ چشم پوشی کی ہے) راہِ عمل کی دونوں جلدوں میں بعض سنگین نوعیت کی غلطیاں بھی موجود ہیں، مثلاً جلد اول حصہ اول صفحہ نمبر ۱۱۹ پر حضرت انس ﷺ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ

کے بجائے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' شائع ہوگیا ہے،صفحہ نمبر۲۲۰ کی دوسری سطر پر'راہ' کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھا گیا ہے،اسی طرح جلد دوم حصہ چہارم صفحہ نمبر۵۷ پر فاطمہ بنت محمد لکھتے وقت محمد کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' نہیں لکھا گیا۔

اس کتاب کی قیمت ۶۰۰ روپے رکھی گئی ہے،اگر اس ایڈیشن کی تعداد ایک ہزار بھی ہو تو قیمت میں صرف پچیس روپے کے اضافے سے کسی بھلے مانس پروف ریڈر کو پچیس ہزار روپے مزید ادا کر کے اس اہم کتاب کی اسی طرح 'ذمہ دارانہ اشاعت' کا حق ادا ہوسکتا ہے،جس ذمہ دارانہ اُسلوب میں ہمارے مؤلف محترم نے اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

○ ○ ○

فتاویٰ

مفتی شاہد علی قاسمی •

شہید کی قسمیں اور ان کے احکام

سوال:- حضرت مولانا محمد یونس صاحب پالن پوری کی کتاب ''بکھرے موتی'' کی جلد نمبر دو میں شہداء کی ۵۶ قسمیں بتائی گئی ہیں، جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) پیٹ کی بیماری میں مرنے والا شہید ہے۔
(۲) حالتِ سفر میں مرنے والا۔
(۳) تپ (یعنی بخار) میں مرنے والا۔
(۴) طلب علم میں مرنے والا۔
(۵) جوشخص مسلمانوں کے لئے غلہ فراہم کرے۔
(۶) جوشخص اپنے اہل وعیال اور اپنے غلام ولونڈی کے لئے کمائے۔
(۷) جوشخص جمعہ کی شب میں مرجائے۔
(۸) جوشخص باوضو رہتا ہو۔

ان سب کی موت شہادت کی موت ہے اور اس طرح کل ۵۶ شہداء کا ذکر کیا گیا ہے —— سوال یہ ہے کہ اگر آپ پوری بتائی ہوئی ۵۶ شہداء کی قسمیں پڑھیں گے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر مرنے والا شہید ہے، اللہ کرے ہر مرنے والا شہید ہو؛ لیکن اس کی مکمل وضاحت درکار ہے۔ (محمد شمشیر عالم، آصف نگر، حیدرآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:- شہداء تین طرح کے ہیں :

(۱) دنیا وآخرت دونوں جہاں میں شہید، جیسے میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے کسی کی جان چلی جائے، ایسے لوگوں کو غسل دیئے بغیر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے گا اور اس کو آخرت میں شہادت کا درجہ ملے گا۔

• استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۲) وہ شہید جو نام ونمود یا کسی اورغرضِ فاسد کے لئے جنگ میں شریک ہوکرمقتول ہوا تو وہ دنیوی اعتبار سے تو شہید ہوگا، یعنی اسے غسل دیئے بغیر نماز جنازہ پڑھ کر دفنایا جائے گا؛ لیکن آخرت میں ثواب کے اعتبار سے شہید نہیں ہوگا۔

(۳) جو آخرت کے اعتبار سے شہید ہو اور دنیا میں غیر شہید، یعنی اسے دنیا میں غسل دیا جائے گا اور نماز جنازہ پڑھی جائے گی، پھر دفنایا جائے گا اور آخرت میں شہیدوں والا ثواب اللہ کے فضل سے پائے گا —— اس قسم میں حضور ﷺ نے بہت سارے لوگوں کو شامل فرمایا، ایک موقع پر پانچ طرح کے لوگوں کو حضور ﷺ نے شہید قرار دیا، ایک موقع پر سات کا ذکر فرمایا، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ شارح بخاری نے اپنی کتاب فتح الباری، حدیث نمبر: ۲۸۲۹ کے ذیل میں بیس (۲۰) طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو کہ حدیث سے ثابت ہے، فقہاء نے ان احادیث میں غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ کا مقصد حصر نہیں ہے؛ بلکہ کچھ عوامل واسباب ہیں جن کی بنا پر یہ مقام دیا گیا ہے، ان احادیث کا احاطہ کرنے کے بعد فقہاء نے ان کے اسباب وعوامل دیکھتے ہوئے بعض دوسرے لوگوں کو بھی شامل کیا ہے، مثلاً جس حدیث میں گھوڑے یا اونٹ سے گر کر مرنے والے کو شہید کہا گیا، تو غور کیا جائے کہ محض اونٹ یا گھوڑے سے گر کر مرنے میں شہادت کی فضیلت منحصر نہیں؛ بلکہ یہ فضیلت ان لوگوں کو بھی حاصل ہوگی جو مروجہ کسی اور سواری سے گر کر مر جائے، یا جیسے طاعون سے مرنے والے کو شہید کہا گیا تو اسی حکم میں وہ لوگ بھی آجائیں گے جو کسی دوسری وباء سے مر جائیں، جیسے ہیضہ وغیرہ۔

اس طرح شہداء کی اقسام میں اضافہ ہوا، اور یہ اضافہ اُمتِ مسلمہ کے لئے باعث رحمت اور خیر ہے اور اُس کے لئے خوش نصیبی کی بات ہے، علامہ سیوطیؒ نے شہداء کی تعداد کو تقریباً تیس (۳۰) بتایا ہے اور بعض اہل علم نے پچاس (۵۰) سے زائد، جیسا کہ رحمتی نے اپنے منظومہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۱)

الغرض! مقصود تعداد نہیں ہے؛ بلکہ کسی شخص کے ساتھ پیش آنے والی وہ غیر طبعی وغیر معمولی کیفیت ہے، جس سے وہ منجانب اللہ دوچار ہوتا ہے، ایسے ناگہانی حالات کے پیش آجانے کی وجہ سے گناہوں کا معاف ہونا اور درجات کی بلندی اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ ثواب میں شہید کے برابر ہوجاتا ہے۔ **وماذالک علی اللہ بعزیز۔**

دو بیویوں کے درمیان ناانصافی

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک کے نکاح میں دو بیویاں ہیں،

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں: فتح الباری: ۶/۵۴-۵۶، حدیث نمبر: ۲۸۲۹، نیز دیکھیں: ردالمحتار: ۳/۱۶۴، الفقہ الاسلامی وادلتہ۔

اس کی پہلی بیوی مع اپنی اولاد کے ایک بستی میں زندگی بسر کررہی ہے اور یہ شخص اپنی دوسری شریک حیات کے ساتھ کسی دوسری بستی میں قیام پذیر ہے، دونوں جگہ مذکورہ شخص کا اپنا ذاتی مکان ہے؛ مگر یہ شخص اپنی دونوں شریک حیات کے مابین مساوات قائم نہیں کر پار ہا ہے، چند باتیں ذیل میں درج کی جارہی ہیں، برائے کرم جواب مرحمت فرما کرشکریہ کا موقع عنایت فرمائیں :

(۱) دونوں بیویوں کے درمیان نان ونفقہ کی ادائیگی میں برابری نہ کرنا از روئے شریعت کیسا ہے؟

(۲) دونوں بیویوں میں سے ایک کوتقریباً دس سالوں سے نان ونفقہ سے محروم رکھنا اوران کے مطالبہ کرنے پر بوڑھاپے کی حالت میں طلاق کی دھمکی دینا کیسا ہے؟

(۳) شوہر کا دونوں بیویوں کی اولاد کے مابین جائیداد و مال کی تقسیم میں عدل ومساوات قائم نہ کرنا کیسا ہے؟

(۴) لڑکیوں کی شادی کے اخراجات باپ کے ذمہ ہے یاماں کے؟

(محمد نسیم اختر، دربھنگہ)

الجواب وباللہ التوفیق:- حدیث شریف ہے کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں برابری اور عدل نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ گرا ہوا ہوگا، پس معلوم ہوا کہ بیویاں اگر متعدد ہیں تو ان کے درمیان کھانے، کپڑے اور شب باشی وغیرہ میں مساوات اور عدل کرنا ضروری ہے، مساوات کو ترک کرنے والا واجب کوترک کرنے والے کی طرح گنہگار اور فاسق ہے اور حق کے مطالبہ پر طلاق وغیرہ کی دھمکی دینا اور معلق بنائے رکھنا گناہ اور سخت ظلم ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا :

عن ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال : إذا كانت عند الرجل إمرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقة ساقط ۔ (۱)

اسی کی روشنی میں فقہاء نے لکھا ہے :

يجب ، وفی ظاهر الرواية أنه فرض أن يعدل فيه أی بالتسوية فی البيتوته وفی الملبوس والماكول ۔ (۲)

---

(۱) ترمذی ، باب القسم:۱/۲۱۷۔ (۲) الدرالمختار علی هامش ردالمحتار:۲/۵۴۶-۵۵۰۔

اسی طرح شوہر کا دونوں بیویوں کی اولاد کے درمیان جائیداد اور مال کی تقسیم میں برابری نہ کرنا حق تلفی اور بہت بڑا ظلم ہے؛ اس لئے اس پر واجب ہے مال و جائیداد کی تقسیم میں دونوں بیویوں کی اولاد کے درمیان عدل سے کام لے؛ چنانچہ روایت ہے :

عن النعمان بن بشير ﷺ انه قال : ان اباه اتى به رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال : انى نحلت ابنى هذا غلاماً كان لى ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : أكل ولدك غلته مثل هذا ؟ فقال : لا ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : فارجعه ، وفى رواية أخرى : اتقوا الله واعدلوا فى اولادكم ، فرجع أبى ، فرد تلك الصدقة ۔ (۱)

از روئے شرع اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہے، خصوصاً لڑکیوں کا نفقہ بلوغ کے بعد شادی ہونے تک باپ کے ذمہ ہے، نیز شادی کے اخراجات بھی باپ کے ذمہ ہیں، الا یہ کہ وہ خود ایسی جائیداد رکھتی ہو، جس کی آمدنی سے اس کی کفالت اور شادی وغیرہ ہوسکے ''**وتجب نفقة الا بنة البالغة على الاب**'' (۲) ''**فالأناث عليه نفقتهن إلى أن اليتزوجن إذا لم يكن لهن مال**'' ۔(۳)

تحریری طلاق کی ایک صورت

سوال:- خدمت اقدس میں دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ میرا نکاح ۲۲ ستمبر ۲۰۱۲ء کو مسماۃ فیروز حسینہ بنت شیخ عبدالصمد صاحب مرحوم سے ہوا، نکاح کے بعد پہلی رات ہی میں دلہن نے یعنی میری بیوی نے کہا کہ مجھے داڑھی والے پسند نہیں، میں آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ، مجھے طلاق دے کر چھوڑ دیجئے ، میں بدنامی کے ڈر سے تین چار دن اس کو سمجھاتا رہا؛ لیکن وہ مصر رہیں کہ نہیں مجھے طلاق دے دو، میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ، بعدازاں وہ میکہ چلی گئی ، اب تقریباً چھ سات ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران مختلف لوگوں سے مختلف طریقوں سے اس کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ؛ لیکن وہ کسی کی سننے کے لئے تیار نہ ہوئی ، طلاق کے مطالبہ پر مصر رہی ، چھ ماہ کے انتظار کے بعد ۶ / مارچ ۲۰۱۳ء کو دو گواہوں کے دستخط کے ساتھ طلاق نامہ وکیل کے ذریعہ سے اس کے گھر روانہ کیا گیا، دومرتبہ بھیجنے پر بھی ان لوگوں نے اس طلاق نامے

(۱) مسلم باب الهبة :۲/۲۹۶ ۔ (۲) هدايه:۲/۴۴۷ ۔ (۳) فتح القدير ، باب النفقة ۔

کونہیں لیا، واپس کر دیا گیا، بعدازاں ایک تلگواخبار کے ذریعہ طلاق نامہ شائع کیا گیا؛ تا کہ وہ اس کو دیکھ لیں اور پڑھیں؛ لہٰذا آپ حضرت والا سے دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا شرعی اعتبار سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں، میں دوسرا نکاح کر سکتا ہوں یا نہیں؟ مجھے نکاح کے پیغامات آرہے ہیں، براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی فتویٰ عنایت فرمائیں۔ (اقبال قاسم بیگ، تنالی، گنٹور)

الجواب وباللہ التوفیق:- دریافت کردہ صورت میں اگر طلاق نامہ صحیح ہے تو آپ کی بیوی فیروز حسینہ بنت شیخ عبدالصمد پر تین طلاق واقع ہو چکی ہے، اور وہ آپ پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی؛ کیوں کہ طلاق نامہ کی جو تحریر بنائی گئی ہے، اس میں کسی شرط کے بغیر مطلق طور پر تین طلاق واقع کرنے کی صراحت ہے، ایسی کوئی قید نہیں کہ جب طلاق نامہ بیوی کے ہاتھ میں جائے، یا بیوی کے گھر پہنچ جائے، یا بیوی کے سرپرست تک پہنچ جائے تب ہی طلاق واقع ہو اور جب کسی قید کے بغیر طلاق دی جائے تو فوری طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس لئے آپ کا رشتہ اس بیوی سے بالکلیہ ختم ہو چکا ہے، آپ کسی اور عورت سے دوسری شادی کر سکتے ہیں۔

بہن کی شادی میں بھائیوں کے اخراجات کی حیثیت

سوال:- زید کا انتقال ۱۹۹۴ء میں ہوا، زید کو چار لڑکے چار لڑکیاں ہیں، جن میں سے تین لڑکیوں کی شادی خود زید نے کی، ایک لڑکی چار لڑکوں کی شادی زید کے انتقال کے بعد ہوئی، جن میں سے تین لڑکوں نے اپنی اپنی شادیاں اپنے خرچ پر کی ہیں۔

(۱) زید کی چھوٹی لڑکی کی شادی میں چاروں بھائیوں نے مشورہ میں یہ طے کیا کہ بہن کی شادی کا خرچ سب مل کر کریں گے؛ لیکن شادی کے موقع پر دو بھائی نے طے شدہ رقم نہ دے سکے جس کی بناپر بڑے بھائی نے شادی کے اخراجات کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، تو آیا بڑے بھائی کی رقم بہن کی شادی کے اخراجات کی زید کے ترکے میں سے نکالا جائے، یا بھائیوں سے لیا جائے؟

(۲) زید کے چھوٹے لڑکے کی شادی کا خرچ بڑے لڑکے نے زید کے ترکے کی رقم سے کی ہے، جب کہ تین لڑکوں نے اپنے اپنے خرچ پر کی ہے، تو زید کے ترکے میں چھوٹے لڑکے کی شادی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) زید کی پوری اراضی بیس ایکڑ ہے جن میں سے چار ایکڑ اراضی کو فروخت کر دیا

گیا ہے، جس کی رقم موجود ہے، زید کی اولاد میں کس طرح تقسیم کیا جائے، اس کو آسان وضاحت کے ساتھ تحریر فرمادیں تو مہربانی ہوگی، حوالہ کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر فرمائیں تو بہت بہتر ہے۔ (حافظ عبدالسبحان خالدی، بنگلور)

الجواب وباللہ التوفیق:- (۱) چاروں بھائیوں نے بہن کی شادی میں اخراجات برداشت کرنے کا معاہدہ کیا تو اس معاہدہ پر قائم رہنا واجب تھا، اللہ تعالیٰ نے آپسی معاہدہ کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے: ''**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ**'' (المائدۃ:۱) جن دو بھائیوں نے معاہدہ کے باوجود رقم نہیں دی انھیں چاہئے کہ معاہدہ کے مطابق خرچ کرنے والے دو بھائیوں کو رقم ادا کریں، بالفرض اگر یہ دو بھائی رقم ادا نہ کریں تو یہ اخراجات زید کے ترکہ سے وصول کرنا درست نہیں؛ کیوں کہ شادی میں بھائیوں کا خرچ کرنا تعاون کے قبیل سے ہے اور تعاون والی رقم کو بلا رضامندی وصول کرنا درست نہیں ہے، اگر زید کے تمام وارثین بہ رضا ورغبت زید کے ترکہ سے شادی کے اخراجات منہا کرنے پر آمادہ ہوں تو پھر زید کے ترکہ سے شادی کے اخراجات وصول کرنے میں مضائقہ نہیں، یا زید کے بعض وارث اس کے لئے آمادہ ہوں تو زید کے ترکہ میں اس کا جو حصہ ہو اس حصہ سے شادی کے اخراجات وصول کئے جاسکتے ہیں، اگر اس کے لئے بھی کوئی تیار نہ ہو اور خرچ کرنے والے بھائیوں نے بہن کے مطالبہ کے بغیر خرچ کیا تھا تو پھر بہن سے بھی زبردستی لینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر یہ بہن خوش دلی سے اپنے حصہ ترکہ سے کچھ دیدے تو پھر لینے میں مضائقہ نہیں۔

(۲) شادی بیاہ کے اخراجات اس وقت بہت زیادہ ہوگئے ہیں، ایسے موقع پر آپس میں تعاون کا جذبہ ہونا چاہئے، اس لئے اگر چھوٹے بھائی کی شادی کے اخراجات میں زید کے تمام وارثین اس بات کا اظہار کردیں کہ باپ کے ترکہ سے چھوٹے بھائی کی شادی ہم سب کے لئے قابل قبول ہے، اور ہم سب کی طرف سے تعاون ہے، تو یہ بہت بہتر اور اخلاق فاضلہ کی بات ہوگی؛ لیکن اگر دوسرے وارثین اس پر آمادہ نہ ہوں، اور زید کے ترکہ سے اپنا پورا حق مانگ رہے ہوں تو پھر انھیں پورا حق دینا ضروری ہوگا، ایسی صورت میں چھوٹے بھائی کو چاہئے کہ اپنے بڑے بھائی سے برادرانہ گفتگو کرتے ہوئے شادی کے کلی یا جزوی اخراجات کو برداشت کرے، اور اگر اس نے بڑے بھائی کو شادی میں خرچ کرنے کو کہا ہو تو پھر ان اخراجات کی حیثیت دین کی ہوگی، ایسی صورت میں یہ بڑے بھائی کو پورا خرچ ادا کرے گا۔

(۳) اگر زید کے وارثین میں ۴ رلڑکے اور ۴ رلڑکیاں ہوں تو زید کی جملہ جائیداد کے بارہ حصے کئے جائیں گے، جن میں دو دو حصہ ہر لڑکا کو اور ایک ایک حصہ ہر لڑکی کو ملے گا —— لہٰذا چار ایکڑ اراضی کو فروخت کرنے سے جو رقم آئی ہو اسے بارہ حصوں میں کرکے ہر لڑکا کو دو حصہ اور ہر لڑکی کو ایک حصہ دیا جائے، اسی طرح باقی سولہ ایکڑ اراضی

میں بھی کریں، تقسیم بالا کے مطابق سولہ ایکڑ اراضی میں ہر لڑکی کا حصہ 1.33 ایکڑ (ایک ایکڑ اور دوسرے ایکڑ کی ایک تہائی) اور ہر لڑکا کا حصہ 2.66 ایکڑ (دو ایکڑ مکمل اور تیسرے ایکڑ کی دو تہائی) ہوگا۔

کمپنی میں رقم جمع کر کے ماہانہ متعینہ نفع کمانا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مندرجہ ذیل مسئلہ کی بابت کہ اگر کوئی کمپنی زید سے کہے کہ تم 14000/ روپیہ جمع کرو، اور ہر دن تمہارے کمپیوٹر پر کوئی سوال یا اس کے علاوہ دیگر کوئی Option آئے گا اور اسے صرف ایک یا دو منٹ تک پڑھنا یا صرف دیکھنا ہے، جس کے عوض تمہیں ہر ماہ -/3500 روپیہ ایک سال تک دیا جائے گا، تو ایسی صورت میں جمع کردہ -/14000 روپیہ صرف چار ماہ میں وصول ہو جاتا ہے، اور اس کے آگے آٹھ ماہ مزید -/3500 روپیہ ماہانہ دیا جائے گا، تو کیا آٹھ مہینہ کی مزید یہ رقم زید کے حق میں شرعی نقطۂ سے جائز ہے، نیز اس معاملہ کی کیا حیثیت ہے؟ (حبیب خان کوتہ پیٹ، حیدرآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:- آپ نے کمپنی کے طریقۂ کار کی جو صورت ذکر کی ہے وہ ''بیع عینہ'' سے قریب تر ہے، ''بیع عینہ'' کی مختلف صورتیں ہیں، ان میں مشہور صورت یہ ہے کہ مثلاً ''ب'' کو نو سو روپے قرض کی ضرورت ہے اور اسے قرضِ حسنہ نہیں مل رہا ہے، اس کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ''الف'' نے ''ب'' سے کہا کہ میرا یہ سامان تم ہزار روپے میں اُدھار خرید لو؛ چنانچہ اس نے خرید لیا، پھر ''الف'' نے وہی سامان ''ب'' سے نو سو روپے میں نقد خرید کر لیا، اس طرح ''ب'' کو نو سو روپے نقد مل گئے ؛ ''الف'' کو اپنا سامان بھی مل گیا—— یہ صورت بہ ظاہر خرید وفروخت کی ہے؛ لیکن درحقیقت بالواسطہ سود کھانے کی ایک شکل ہے، اس لئے جمہور فقہاء نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، غور کیا جائے تو دریافت کردہ صورت میں چودہ ہزار روپے دے کر کمپنی کا ممبر بننا ، پھر معمولی قسم کا کوئی سوال یا کسی Option کا جواب دے کر ماہانہ ساڑھے تین ہزار روپے عوض ایک سال تک حاصل کرنا سود سے بچنے کا حیلۂ محض ہے، درحقیقت یہ نقد روپے کا تبادلہ اُدھار روپے سے ہے، یعنی نقد چودہ ہزار گاہک کی طرف سے اور اس کے عوض اُدھار بیالیس ہزار کمپنی کی طرف سے، جسے کمپنی ماہ بہ ماہ ایک سال میں واپس کرے گی، اور جب روپے کا تبادلہ روپے سے ہو تو جانبین سے برابری بھی ضروری ہے، اور نقد معاملہ بھی اور یہاں یہ صورت نہیں پائی جارہی ہے، یعنی برابری بھی نہیں ہے اور نقد بھی نہیں ہے، اس لئے یہ صورت سود میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ واللہ اعلم

داماد کوکھیتی کی ذمہ داری سونپنے پر کچھ حصۂ زمین کا وعدہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ عمر کی شادی کے بعد ان کے خسر نے اپنے دوسرے نمبر کے داماد عمر کوکھیتی کے کام کی ذمہ داری سونپی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ کچھ زمین کا حصہ دیں گے؛ لیکن اس کی وضاحت نہ ہوئی کہ کچھ عرصہ کے بعد خسر کا انتقال ہوگیا، انتقال سے پہلے کھیتی کے کام کو تقریباً دس سال انجام دیئے، انتقال کے کچھ سال بعد بڑے لڑکے نے عمر کو بلا کر یہ ذمہ داری دی کہ کھیتی کا کام آپ اس طریقہ سے کریں گے کہ پیسہ میں لگاؤں گا، نگرانی آپ کریں گے، کھیتی سے جو بھی پیداوار ہوگی اس میں سے آدھا آدھا تقسیم کرلیں گے، جس کا سلسلہ تقریباً پندرہ سال سے چل رہا ہے، اب جب تقسیم کا وقت آیا تو عمر کا کہنا ہے کہ میں اپنے خسر کی اولاد کے برابر کا حقدار ہوں، تو کیا عمر کا کہنا شریعت کی نظر میں درست ہے کہ نہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں —— عمر کے خسر کی اولاد کا کہنا یہ ہے کہ والد نے جو وعدہ دینے کا کہے ہیں تو کتنا دیں گے، وضاحت نہ ہونے کی صورت میں عمر کے خسر کی اولاد محنتانہ کے طور پر معقول محنتانہ دے گی، جب کہ عمر کی اہلیہ دوسرے نمبر کی لڑکی ہے اور عمر کے خسر کو چار لڑکے چار لڑکیاں ہیں —— قرآن وحدیث کی روشنی میں حوالہ کے ساتھ آسان وضاحت اور تقسیم کا طریقہ تحریر فرمائیں۔ (حافظ محمد عبدالسبحان خالدی، بنگلور)

الجواب وباللہ التوفیق:- بہ شرط صحت سوال خسر نے مبہم وعدہ کیا تھا، جو وہ زندگی میں پورا نہیں کرسکے، اب انتقال کے وقت اراضی میں عمر کا اپنے آپ کو حصہ دار سمجھنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ ان اراضی کے تعلق سے عمر کی حیثیت زیادہ سے زیادہ تعاون بالا جرت کی ہوسکتی ہے، اور مرحوم کی اولاد معقول محنتانہ دینے کے لئے تیار ہے، اس لئے عمر معقول محنتانہ سے زیادہ کا استحقاق نہیں رکھتا ہے۔

غیر مسلم کو ہوٹل اور مکان کرایہ پر دینا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ میرا ایک کمپلیکس ہے، جس کا ایک حصہ لارڈجنگ کے مقصد کے لئے ہے، دوسرا حصہ ہوٹل کے لئے ہے، تو کیا ایک حصہ کا استعمال لارڈجنگ کے لئے کیا جاسکتا ہے، جب کہ کمرہ بک کرنے والا کس

مقصد کے لئے بک کر رہا ہے، معلوم نہیں ہو پاتا ہے، نیز ہوٹل چلانے کے لئے ایک غیر مسلم کو کرایہ پر دینا چاہتا ہوں؛ لیکن غیر مسلم اپنے بعض گاہکوں کو ممکن ہے کہ کھانا کے ساتھ شراب بھی سپلائی کرے، جیسا کہ بعض غیر مسلم حضرات کھانے کے موقع پر شراب بھی استعمال کرتے ہیں، تو کیا ایسے غیر مسلم کو ہوٹل کرایہ پر لگا سکتے ہیں؟

(عبداللہ، مہدی پٹنم، حیدرآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:- (۱) رہائشی مقصد سے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے، خواہ کرایہ پر لینے والا مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے؛ لہٰذا آپ کی عمارت کا وہ حصہ جو رہائشی مقصد کے لئے ہے اسے لارڈ جنگ کے طور پر استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں؛ البتہ اس کا خیال رہے کہ اگر کوئی ایسا کرایہ دار آئے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس میں فحاشی کرے گا، یا فحاشی کا اڈہ چلائے گا، تو ایسے شخص کو کرایہ پر دینے سے لازماً احتراز کریں۔

(۲) جس طرح رہائش کے لئے غیر مسلم کو مکان دیا جاسکتا ہے، اسی طرح ہوٹل بھی غیر مسلم کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ اس کا مقصد گاہکوں کو غذائیں فراہم کرنا ہے جو جائز عمل ہے؛ البتہ غیر مسلم حضرات بعض گاہکوں کو شراب بھی سپلائی کر سکتے ہیں؛ لیکن یہ معاملہ ذیلی طور پر ہے، یعنی نہ تو اس کا مقصد شراب کا مستقل کاروبار ہے اور نہ آپ اسے شراب کے کاروبار کے لئے دے رہے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی غیر مسلم کو مکان کرایہ پر دیں اور وہ رہائش اختیار کرتے ہوئے گھر کے کسی گوشہ میں اپنے دیوی دیوتا کی پرستش بھی کرلیں، تو ایسے غیر مسلم کو بھی مکان کرایہ پر دے سکتے ہیں؛ چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: ''**لو آجره للسکنٰی جاز وهو لا بد من عبادته فيه**''(۱) ——لہٰذا آپ وہ مکان کسی غیر مسلم کو ہوٹل چلانے کے لئے دے سکتے ہیں اور اس کا کرایہ آپ کے لئے جائز ہوگا۔

متفرق مسائل

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ:

(۱) زید شیعوں کی مجلس جلوس اور دعوتوں میں پابندی سے شرکت کرتا ہے، محرم کے مہینہ میں کالا کپڑا پہنتا ہے، تاکید کرنے پر کہتا ہے کہ میرے والد شیعہ تھے، اس لئے ان کی روح کی تسکین کے لئے یہ کام کرتا ہوں؛ حالاں کہ زید اپنے آپ کو سنی بھی کہتا ہے، مگر نماز نہیں پڑھتا، صرف جمعہ وعیدین، وہ بھی پابندی سے نہیں، من گھڑت مسئلہ

---

(۱) ردالمحتار: ۹/۵۶۲۔

بیان کرتا ہے، جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز، حلال کو حرام اور حرام کو حلال، مگر جس طرح عاشور خانوں کے اہم پروگرام میں شریک ہوتا ہے، اور مسجد کی جانب سے جو تحفہ تحائف امام صاحب ومؤذن صاحب کو دیئے جاتے ہیں، اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، حصہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک روپیہ خرچ نہیں کرتا، مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اس کے حامی ہیں، ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں، چاپلوسی کرنے والے ہیں، انھیں بھی انعام دیا جائے اور محلّہ والوں میں مقبولیت ہوجائے اور محلّہ والے جان لیں کہ جسے ہم چاہیں انعام وتحفہ دیں، ایسے شخص کو کیا کہا جائے گا؟ شیعہ، سنی یا منافق؟ کیا ایسے شخص کے لئے تجدید ایمان ضروری نہیں؟ کیا ایسے شخص کو مزید آگے بڑھنے سے روکنے کی ذمہ داری مسجد کے ذمہ داران ومحلّہ والوں کی نہیں ہے؟

(۲) مسجد کے احاطہ میں جہاں ملگیاں تھیں یا وضوخانہ وبیت الخلاء تھا، ایسی جگہ امام ومؤذن صاحبان کو کمرہ بنا کر دینا اور فیملی رکھنے کی اجازت دینا شرعاً کیسا ہے؟

(۳) کیا رمضان میں نماز تراویح میں خواتین مسجد میں آکر باجماعت تراویح ادا کرسکتی ہیں، جس کی امامت مرد کررہا ہو؟

(۴) مسجد کی ملگی کے پیچھے دروازہ سے لگا ہوا قبرستان ہے، اس ملگی میں کام کرنے والے قبرستان میں شراب نوشی کرتے ہیں اور نیچے ملگی اوپر مسجد، ملگی میں گانے لگائے جارہے ہیں، کیا ایسے شخص کو برے کام سے روکنے کی ذمہ داری ذمہ دارانِ مسجد کی نہیں ہے، کیا ایسے شخص کو مسجد کی ملگی میں رکھا جاسکتا ہے۔

(ایاز ظہیر، سعید آباد، حیدرآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:- (۱) اسلام نے بلا تفریق مذہب وملت اخلاقی رواداری کی تعلیم دی ہے، (دیکھئے: الممتحنہ: ۸) لیکن عقائد کے معاملہ میں تساہل ومداہنت ہرگز درست نہیں، شیعوں کی گمراہی بلکہ بعض عقائد کفریہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے، اس لئے شیعوں کے مذہبی کاموں میں شرکت ناجائز ہے، اس سے اجتناب لازم ہے، شیعوں کی متابعت کرتے ہوئے کالا کپڑا پہننا، ان کے پروگرام میں شریک ہونا جائز نہیں، زید کا یہ سمجھنا کہ کالا کپڑا پہننے سے والد کی روح کو تسکین ہوگی، بے بنیاد بات ہے، ایسے توہمات میں مبتلا ہونے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے، پنج وقتہ نمازوں کی پرواہ نہ کرنا اور زندگی کو ان نمازوں سے دور رکھنا گناہ کبیرہ ہے اور احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہیں، اسی طرح مسائل دینیہ میں من مانی حکم لگانا، اور جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز

بتانا غضبِ خداوندی کو دعوت دیتا ہے — مسجد میں جو رقم اعانت آتی ہے، وہ مسجد اور مسجد کی ضروریات کے لئے ہوتی ہے، مسجد کے ذمہ داروں کا فریضہ ہے کہ رقم اعانت کا استعمال صحیح مصرف میں کریں، غیر متعلقہ افراد کا اس رقم سے تعاون کرنا جائز نہیں، الا یہ کہ رقم دینے والا خود اس کی اجازت دیدے — اگر زید کی صورتِ حال یہی ہے جو سوال میں درج ہے تو یہ انتہائی قابل افسوس ہے، اسے سچی توبہ کرتے ہوئے فکر ونظر اور قول وعمل میں اصلاح کر لینی چاہئے۔

(۲) مسجد کے احاطہ میں بنی ہوئی ملگیاں، وضوخانے امام ومؤذن کے کمرے اور بیت الخلاء وغیرہ ''مصالح مسجد'' کہلاتی ہیں، اور مصالح مسجد میں حسبِ ضرورت مناسب تبدیلیاں لا سکتے ہیں، اس لئے ملگیوں یا وضوخانے یا طہارت خانے کی جگہ امام ومؤذن کے کمرے بنائے جائیں اور وضوخانے یا طہارت خانے کسی اور مناسب جگہ بنائے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۳) جو حکم پنج وقتہ نمازوں میں عورتوں کے مسجد آنے کا ہے، وہی حکم نماز تراویح میں شرکت کا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عورتیں مسجد نبوی آیا کرتی تھیں، پھر بھی رسول اللہ ﷺ کو یہ بات محبوب تھی کہ عورتیں گھر کے ایک گوشہ میں تنہا نماز پڑھیں، (دیکھئے: مسند احمد بن حنبلؒ، حدیث نمبر: ۲۶۵۵، فتح الباری: ۳۵۰/۲، بیہقی: ۱۳۱/۳) — اس سلسلہ میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

> عام طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ عورتوں کا مسجدوں میں آنا بہتر نہیں، یہ رائے صرف حنفیہ کی نہیں؛ بلکہ دوسرے فقہاء کی بھی ہے، فقہاء شوافع میں مشہور محدث اور فقیہ امام نوویؒ نے شرح مہذب: ۱۹۸/۴ میں اور فقہاء حنابلہ میں ابن قدامہ مقدسیؒ نے اپنی مشہور کتاب المغنی: ۱۸/۳ میں بھی یہی لکھا ہے، اس لئے ...... موجودہ حالات میں (مسجد میں عورتوں کا آنا) کراہت سے خالی نہیں کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔(۱)

(۴) شراب نوشی حرام ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہیں، ہر مسلمان کی زندگی اس سے پاک ہونی چاہئے، گانا سننا بھی حرام کاموں میں سے ہے، اس سے بھی اجتناب ضروری ہے، نیز مسجد کی ملگیوں میں گانا لگانا اور سننا احترام مسجد کے بھی منافی ہے، مسجد کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ مسجد کی ملگیوں میں گانا سننے والے کرایہ داروں کو سمجھائیں اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کریں، منع کرنے کے باوجود باز نہ آئیں تو دین دار کرایہ داروں کو لانے کی کوشش کریں، وباللہ التوفیق۔

○ ○ ○

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۲۱۴/۲۔

مکہ فقہ اکیڈمی کا اکیسواں سیمینار — مختصر رپورٹ

خالد سیف اللہ رحمانی

عالمی سطح پر ملتِ اسلامیہ کو مربوط کرنے کی ایک منظم کوشش ''رابطہ عالم اسلامی'' ہے، جس کا صدر دفتر مکہ مکرمہ میں ہے، رابطہ عالم اسلامی کے تحت مختلف جہتوں سے اسلامی تعلیمات و اقدار کے فروغ اور مسلمانوں کی تنظیم واجتماعیت کے لئے ادارے قائم ہیں، اس کا اہم ترین شعبہ ''**المجمع ا لفقهی الاسلامی**'' ہے؛ بلکہ اس وقت اس کا سب سے زیادہ مقبول اور نمایاں ذیلی ادارہ یہی ہے، اس اکیڈمی کے قیام کی تاریخ یہ ہے کہ رابطہ نے رجب ۱۳۸۳ھ کو مختلف اسلامی ممالک کے علماء واصحابِ افتاء پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا، پھر ذوالحجہ ۱۳۸۴ھ میں رابطہ کے مرکزی دفتر میں منعقد ہونے والی اس کی سالانہ کانفرنس میں قرارداد پاس ہوئی کہ نئے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ایسی اکیڈمی قائم ہونی چاہئے، جو عالم اسلام کے تمام حصوں سے اہل تحقیق نمائندہ علماء پر مشتمل ہوں۔

اس قرارداد کو عملی شکل دینے کے لئے رابطہ نے اپنی نشست منعقدہ ذوالقعدہ وذوالحجہ ۱۳۸۵ھ میں مجلس تاسیس ہی کے بعض ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے، جب کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ عبدالعزیز ابن باز، شیخ محمد علی الحرکان، شیخ محمد محمود صواف اور شیخ محمد فاضل بن عاشور پر مشتمل کمیٹی بنادی گئی، جو سب کے سب رابطہ کی مجلس تاسیسی کے ممبر تھے اوران کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مجوزہ اکیڈمی کا خاکہ پیش کریں، اس کمیٹی نے ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ کی میٹنگ میں اپنی رپورٹ پیش کردی اور دس ارکان پر مشتمل اکیڈمی کا بورڈ بنادیا گیا، جس میں برصغیر سے مولانا سید الاعلیٰ مودودی کا انتخاب ہوا، یہ تمام ارکان مسلم ملکوں کی نمائندگی کرتے تھے، اس کے بعد رابطہ کے سکریٹریٹ نے محرم ۱۳۹۶ھ میں باضابطہ ''**المجمع الفقهی الاسلامی**'' کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل کی اوراس میں اسلامی علوم بالخصوص قانونِ شریعت کے ماہرین کو شامل کیا گیا، اس میں بارہ ملکوں کو نمائندگی دی گئی، جن میں ہندوستان کے علاوہ باقی سب مسلم ممالک ہیں، اس میں ہندوستان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور پاکستان سے مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندویؒ کا نام شامل تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد ہندوستان سے ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری کا

اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندویؒ کے بعد پاکستان سے مولانا محمد تقی عثمانی کا انتخاب عمل میں آیا، ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری کے بعد ہندوستان سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے مؤسس مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا ہندوستان سے انتخاب کیا گیا، جب کہ ان کی زندگی کا آفتاب لبِ بام تھا، اس حقیر کے لئے شرف وسعادت کی بات ہے کہ قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۴۳۳ھ م ۲۰۱۲ء میں اس حقیر کا انتخاب عمل میں آیا اور اس طرح اس کے لئے ایک ایسی مجلس سے استفادہ کی راہ ہموار ہوئی، جس میں عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتیں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

اس انتخاب کے بعد رابطہ عالم اسلامی کی اس انٹرنیشنل اکیڈمی کا اکیسواں فقہی سیمینار ۲۴-۲۸ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ مطابق ۸-۱۲ر دسمبر ۲۰۱۲ء کو مکہ مکرمہ میں منعقد ہوا اور اس حقیر کو بھی سیمینار میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، ۲۴ر محرم کو صبح ۹ بجے رابطہ کے مرکزی کیمپس کے سیمینار ہال میں اجلاس کا آغاز ہوا، یہ احاطہ خاصا وسیع، خوبصورت اور جاذب نظر ہے، جو ایک بڑی بلڈنگ اور مسجد پر مشتمل ہے، اس وسیع وعریض بلڈنگ میں رابطہ کے بہت سے شعبے قائم ہیں اور سیمینار کے چھوٹے بڑے کئی ہال ہیں، اکیڈمی کا یہ فقہی سیمینار ایک متوسط حجم کے ہال میں منعقد ہوا، جس میں شرکاء کی تعداد کم وبیش ۳۰ رہی ہوگی، ان میں ۱۵ کے قریب تو اکیڈمی کے ارکان تھے اور بقیہ خصوصی مدعوئین، مدعوئین خصوصی میں ہندوستان کی ایک جانی پہچانی شخصیت اور صاحبِ نظر عالم دین مولانا بدرالحسن قاسمی کی بھی تھی، جو رابطہ کے شعبۂ موتمرات میں رکن منتخب ہو چکے ہیں، یہی شعبہ رابطہ کے مختلف جلسوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔

سیمینار کا افتتاح سعودی عرب کے مفتی عام اور رابطہ کے صدر شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ نے اپنے مختصر خطاب سے کیا، رابطہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالمحسن ترکی رابطہ کے دوسرے پروگراموں کی طرح اس پروگرام کے بھی روحِ رواں رہے، سیمینار کے تمام ہی شرکاء علمی وفکری اعتبار سے ممتاز حیثیت کے حامل افراد تھے، اکیڈمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر صالح بن زابن المرزوقی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے، شریک ہونے والی اہم شخصیتوں میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مولانا محمد تقی عثمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مدعوئین میں ڈاکٹر صالح البار بھی تھے جو میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور احکامِ شریعت سے مربوط میڈیکل مسائل کو بڑی خوش سلیقگی وخوش اُسلوبی کے ساتھ واضح کرتے ہیں، یہ حقیر ان کی اس طرح کی تحریروں کو پڑھ چکا تھا، اس موقع پر پہلی بار ان سے دید وشنید ہوئی، سیمینار میں سات مسائل زیر بحث تھے: صاحب دین پر زکوٰۃ کا واجب ہونا، مفقود الخبر کے انتظار کی مدت، ۴۸ تا ۶۶ ڈگری شمال وجنوبی عرض البلد کے درمیان واقع ہونے والے ملکوں میں اوقاتِ نماز کا مسئلہ، ۱۸ر سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی، حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت، ڈاکٹر کا زوجین میں سے کسی ایک کی میڈیکل رپورٹ سے دوسرے کو مطلع کرنا، زیرولایت افراد کے علاج کے سلسلہ میں ولی کی ذمہ داریاں اور اختیارات، ولدالزنا کے نسب کا زانی سے الحاق۔

مختلف موضوعات پر مختلف مقالہ نگاروں کو عرض مسئلہ پیش کرنے کا موقع دیا گیا، تاخیر سے قابل ادائیگی دیون پر زکوٰۃ سے متعلق موضوع اس حقیر سے متعلق کیا گیا تھا؛ چنانچہ اس حقیر نے پیش کیا، زیر بحث مسائل میں سے دومسئلوں پر کافی مناقشہ ہوا، ایک: ۱۸؍سال سے کم عمر کی لڑکیوں کا نکاح، دوسرے: جو بچے زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہوں، زانی سے ان کے نسب کا اثبات، شرکاء میں سے بعض حضرات کا خیال تھا کہ زنا میں ولدالزنا کا قصور نہیں، قصور اس کے والدین کا ہے؛ اس لئے اس کے والد کو ضرور سزا دی جانی چاہئے ؛ لیکن بچہ کی رعایت کرتے ہوئے فقہاء کے اس شاذ قول کو قبول کر لینا چاہئے ،جس کے مطابق زانی سے اس بچہ کا نسب ثابت کیا جاتا ہے اور تمام حقوق متعلق ہوتے ہیں، شرکاء کی غالب اکثریت نے اس رائے سے اختلاف کیا اور اس کہا کہ یہ اس خدا بیزار تہذیب کی تائید وتقویت کے مترادف ہوگا، جو زنا کو بھی قانوناً درست سمجھتے ہیں اور اس تعلق کو بھی ثبوت نسب کا ایک ذریعہ مانتے ہیں؛ چنانچہ اس موضوع کو واپس لے لیا گیا۔

دوسرا موضوع جس پر خاصی بحث ہوئی، وہ ہے ان لڑکیوں کے نکاح کا جو بالغ ہو چکی ہیں؛ لیکن ان کی عمر ۱۸؍سال سے کم ہے، یہ موضوع اس لئے اہم ہے کہ اقوام متحدہ کی ہدایات میں نکاح نابالغان کو منع کیا گیا ہے اور لڑکوں کے لئے ۲۱؍سال اور لڑکیوں کے لئے ۱۸؍سال عمر بلوغ مانی گئی ہے، نکاح نابالغان کے درست نہ ہونے پر قدیم فقہاء کے یہاں بھی بعض اقوال ملتے ہیں، کچھ حضرات کا رجحان اس رائے کو قبول کرنے کی طرف تھا، اس مسئلہ پر تقریباً برابر میں رائے منقسم تھی، ایک نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو چیزیں جائز ہوں اور جس میں دونوں پہلوؤں کی گنجائش ہو، اس میں حکومت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی ایک پہلو کو لازم قرار دے دے، دوسرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ نابالغ کے نکاح کا درست ہونا مذاہبِ اربعہ اور جمہور کی متفق علیہ رائے ہے اور اس سلسلہ میں جو اختلاف نقل کیا گیا ہے، وہ ایک قولِ شاذ کے درجہ میں ہے؛ اس لئے اس رائے کو قبول نہیں کیا جا سکتا، راقم الحروف کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا، ڈاکٹر قرضاوی صاحب برابر ''ولی امر'' کے اختیار کی بات کر رہے تھے اور ان کی بھاری بھرکم شخصیت کی وجہ سے اس رائے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، راقم الحروف نے ہمت کر کے دو باتیں عرض کیں: ایک یہ کہ مباحات دو قسم کے ہیں: ایک وہ مباحات ہیں، جن کے جائز ہونے کی صراحت نصوصِ شرعی میں موجود ہے، دوسرے وہ مباحات ہیں جن کے بارے میں کتاب وسنت خاموش ہے اور ''الاصل فی الاشیاء الاباحت'' کے تحت اسے مباح مانا گیا ہے، اس دوسری قسم کے مباحات میں ولی امر کو کسی ایک پہلو کے لازم کرنے کا اختیار ہے؛ لیکن پہلی قسم کے مباحات میں اس طرح کا اختیار نہیں ہے اور اس کی دلیل ''لم تحرم ما أحل اللہ لک تبتغی مرضات أزواجک'' ہے، کہ جب نبی کو ایسے مباح امر میں کسی ایک پہلو کے ایجاب کا حق نہیں تو ولی امر کو کیسے ہوسکتا ہے؟ دوسرے ہندوستان جیسے مسلم اقلیت ممالک میں اس موضوع پر حکومت کے ساتھ ہم لوگوں کی لڑائی ہے اور ہم نکاح نابالغان کے مسئلہ پر

یہ کہہ کر اصرار کررہے ہیں کہ ہماری شریعت میں اس کی اجازت دی گئی ہے، اگر یہاں اس طرح کا فیصلہ ہوگا تو اس سے ایک منفی پیغام جائے گا، بہرحال یہ موضوع ملتوی کردیا گیا، بعد میں جامعہ ازہر کے ایک استاذ اور اکیڈمی کے فاضل رکن نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے مناقشات ماشاءاللہ فقہی اُصولوں پرمبنی ہوتے ہیں، اسی طرح حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی بڑی حوصلہ افزائی کے کلمات کہےاور اپنی دُعاؤں سے نوازا۔

بحمداللہ اکیڈمی میں تمام اراء کو پورے اہتمام کے ساتھ سنا جاتا ہے، ہر ایک کی بات کو اہمیت دی جاتی ہے اور چوں کہ افراد کی کثرت نہیں ہوتی؛ اس لئے علمی تبادلۂ خیال کا ماحول شروع سے آخر تک رہتا ہے، مناقشہ میں حصہ لینے والوں میں مولانا بدرالحسن قاسمی (نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کا بھی نمایاں حصہ رہا اور انھوں نے بھی دو موضوعات پر عرض مسئلہ پیش کیا، سیمینار کی اختتامی نشست میں تجاویز پیش کی گئیں، نیز خاصی رد وقدح اور معمولی ترمیمات کے ساتھ تجاویز منظور ہوئیں، تجاویز کی منظور کے بعد مفتی عام نے اختتامی خطبہ دیا، ڈاکٹر ترکی نے شکریہ ادا کیا، اکیڈمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مرزوقی نے کلمات تشکر پیش کیا اور بلند پایہ عالم دین ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے بھی مختصر طور پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، یہ بات بہت بہتر محسوس ہوئی کہ سیمینار کی تمام نشستیں وقت پر شروع ہوئیں اور وقت پر اختتام کو پہنچیں، نیز نظم ونسق کی بہتری نے تمام مہمانوں کو متاثر کیا، رابطہ مہمانوں کے قیام کے لئے اپنے کیمپس میں تعمیر شدہ وسیع مہمان خانہ کا بھی استعمال کرسکتا تھا؛ لیکن خاص طور پر حرم شریف کے بالکل قریب ہوٹل میں قیام کا نظم کیا گیا، اس سے یہ سہولت ہوئی کہ سیمینار کے خالی دنوں میں بھی اور سیمینار سے بچے ہوئے اوقات میں بھی ہم لوگوں کو حرم شریف میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی، فجزاہم اللہ خیرالجزاء۔

○ ○ ○

خبرنامہ

(جمادی الاولیٰ–شوال ۱۴۳۴ھ، اپریل–ستمبر ۲۰۱۳ء)

مولانا احسان الحق مظاہری •

● ۲۹ر جمادی الاولیٰ، مطابق ۱۱ر اپریل ۲۰۱۳ء کو مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ نلگنڈہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، یہ اس شہر میں طالبات کی سب سے قدیم درسگاہ ہے، مولانا رحمانی نے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا۔

● امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کی دعوت پر ۱۴ر اپریل کو مولانا رحمانی کلکتہ تشریف لے گئے، یہاں صبح ۹ تا نماز ظہر ''تفہیم شریعت'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے پروگرام میں کلیدی خطبہ دیا، عصر کے بعد تجار کی ایک خصوصی نشست سے خطاب کیا اور بعد نماز مغرب 'تعمیر ملت' کے عنوان سے منعقد ہونے والے جلسۂ عام میں خطاب فرمایا، یہ پروگرام امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ وجھارکھنڈ کی دعوت پر ہوا تھا۔

● ۴ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۵ر اپریل ۲۰۱۳ء کو آپ کلکتہ سے ناگپور پہنچے اور یہاں سے سیدھے امراوتی تشریف لے گئے، یہاں مسلم پرسنل لابورڈ کے تحت دارالقضاء کا سالانہ جلسہ تھا، اس میں خطاب کیا، پھر ۱۶ر اپریل کو ناگپور میں مختصر توقف کرکے وہاں کے ذمہ داروں سے دارالقضاء کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا، اس علاقہ میں بحمد اللہ معہد کے فضلاء بڑی تعداد میں ہیں، اس پروگرام میں مولانا عتیق احمد بستوی (کنوینر دارالقضاء کمیٹی بورڈ) بھی شریک تھے۔

● ۸ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۹ر اپریل ۲۰۱۳ء کو جامعۃ القرآن حیدرآباد کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، مولانا رحمانی نے جلسہ کی صدارت بھی کی اور خطاب بھی فرمایا۔

● ۹ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۰ر اپریل ۲۰۱۳ء کو اہل چنئی کی دعوت پر مولانا رحمانی نے وہاں کا سفر کیا، انجمن حمایت اسلام کے وسیع ہال میں جدید میڈیکل مسائل پر آپ نے تفصیلی خطبہ دیا اور سوالات کے جواب دیئے، میڈیکل پیشہ سے وابستہ نیز دیگر دانشور حضرات بڑی تعداد میں شریک تھے، اسی دن بعد نماز عشاء ایک عوامی جلسہ سے بھی خطاب ہوا۔

● ناظر کتب خانہ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

● ۱۳؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق: ۲۴؍اپریل ۲۰۱۳ء کو معہد کی شاخ ''مدرسہ عبد اللہ بن مسعودؓ'' (برائے مختصر مدتی عالم کورس) کا ششماہی امتحان کے نتائج کی مناسبت سے جلسہ ہوا، مولانا رحمانی نے صدارت کی، مولانا سرفراز احمد قاسمی نے پروگرام چلایا، مولانا حافظ خواجہ نذیر الدین سبیلی، ڈاکٹر اقبال احمد انجینئر وغیرہ کے خطابات ہوئے۔

● ۱۴؍جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۵؍اپریل ۲۰۱۳ء کو امریکن کونسلنٹ کے نمائندے اور ان کے ساتھ ایک مصری نژاد امریکی فاضل تشریف لائے، انھوں نے شرقِ اوسط کے موضوع پر خطبہ دیا، خطبہ کے بعد سوال وجواب کی طویل نشست ہوئی، اساتذہ وطلباء نے بہت سے سوالات اُٹھائے اور عالم اسلام سے متعلق امریکہ کے رویہ پر تنقید کی، امریکی سفارت خانے کے نمائندے نے صبر وتحمل کے ساتھ سوالات سنے، اگرچہ ان کے جوابات غیر تشفی بخش رہے۔

● معہد کے ایک فاضل مولانا محمد طفیل انعامی کی دعوت پر ۱۶؍جمادی الاخریٰ مطابق ۲۷؍اپریل ۲۰۱۳ء کو مولانا رحمانی گوا ہوتے ہوئے بلگام پہنچے، وہاں اسی دن شب میں عوامی اجلاس ہوا اور اگلی صبح کو علماء کے ایک اجتماع سے آپ نے خطاب کیا، پھر ۱۷؍جمادی الاخریٰ ۲۸؍اپریل کو دار القضاء کے قیام کے سلسلے میں کولہا پور تشریف لے گئے اور وہاں رات ایک بڑے جلسے سے خطاب کرنے کے بعد پونہ ہوتے ہوئے حیدرآباد واپس ہوئے، کولہا پور میں معہد کے ایک فاضل مولانا اشرف علی کو مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے قاضی مقرر کیا گیا ہے، اس نشست میں کولہا پور میں مولانا عتیق احمد بستوی (کنوینر دار القضاء کمیٹی) بھی تشریف لائے اور انھوں نے بھی خطاب کیا۔

● ۳۰؍جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۱؍مئی ۲۰۱۳ء کو مدرسہ انوار العلوم ورنگل کا سالانہ جلسہ مولانا رحمانی کے زیر صدارت منعقد ہوا، جس میں علماء واہل دانش کی بڑی تعداد شریک تھی، جناب عبد الجلیل صاحب اس جلسہ کے داعی تھے اور معہد کے ٹرسٹی جناب حیدر محی الدین غوری صاحب بھی اجلاس میں شریک تھے۔

● مؤرخہ: ۱۳؍مئی ۲۰۱۳ء کو ''ایک دن کا مدرسہ'' پروگرام منعقد ہوا، جس میں طلبہ ہی نے تمام انتظامی وتعلیمی اُمور انجام دیئے اور سارے اسباق پڑھائے، نیز بعد نماز مغرب ''خواتین کا تحفظ — دشواریاں اور حل'' کے عنوان سے مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی، طلبہ ہی نے اس کی صدارت اور نظامت کے فرائض انجام دیئے اور طلبہ ہی نے خطاب کیا، اس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے متعدد ہندو مذہبی رہنماؤں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، اساتذہ نے فجر سے لے کر عشاء تک پورے پروگرام کی نگرانی کی اور اخیر میں ان اُمور کی طرف توجہ دلائی، جن میں کمی محسوس ہوئی۔

● ۳-۴؍رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۴-۱۵؍مئی ۲۰۱۳ء کو ''تفہیم شریعت کمیٹی برائے خواتین'' کی طرف سے تفہیم شریعت ورکشاپ منعقد ہوا، جس میں بڑی تعداد میں قانون داں اور تعلیم یافتہ خواتین اور معلمات وطالبات نے شرکت کی، محترمہ جلیسہ یاسین ایڈوکیٹ اس اجلاس کی داعی تھیں، مولانا رحمانی نے اس میں کلیدی خطبہ دیا، معہد سے مفتی اشرف علی قاسمی، مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی اور مولانا محمد اعظم ندوی نے بھی مختلف موضوعات پر خطبات دیئے اور مسلم پرسنل لا سے متعلق قانون کی وضاحت کی۔

● ۱۵؍رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۶؍مئی ۲۰۱۳ء کو جامعہ سعیدیہ بنگلور کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب امیر شریعت کرناٹک نے صدارت کی اور مولانا رحمانی نے کلیدی خطبہ دیا۔

● ۱۸-۱۹؍رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۹-۳۰؍مئی کو دہلی میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی مجلس عاملہ اور ٹرسٹ کی مجلس منعقد ہوئی، مولانا رحمانی نے بحیثیت جنرل سکریٹری اس میں شرکت فرمائی۔

● ۲۱؍رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱؍جون ۲۰۱۳ء کی شام کو معہد کے پارک میں ''مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ'' سے فارغ ہونے والے طلبہ کو بخاری شریف کی آخری درس کا درس دینے کے لئے خصوصی نشست منعقد ہوئی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے صدارت کی، مولانا سید محمد ولی رحمانی نے حدیث کا درس دیا اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے فارغین کو مستقبل کے سلسلہ میں نصیحتیں کیں۔

● ۲۲؍رجب ۱۴۳۴ء مطابق ۲؍رجون ۲۰۱۳ء روز اتوار کو آفیسرس میس ملک پیٹ حیدرآباد میں معہد کا بارہواں جلسۂ تقسیم اسناد مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے زیر صدارت منعقد ہوا، مولانا سید محمد ولی رحمانی (سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور نہایت اہم خطاب فرمایا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کلیدی خطبہ پیش کیا، پروفیسر سلیمان صدیقی (سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)، پروفیسر مولانا عبدالمجید نظامی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے بھی خطاب کیا، جناب اقبال احمد انجینئر نے معہد کی رپورٹ پیش کی اور جناب محمد جعفر صاحب نے خیر مقدمی کلمات کہے، مفتی اشرف علی قاسمی نے شکریہ ادا کیا، جب کہ مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● اس سال معہد کے مختلف شعبوں سے فارغ ہونے والے فضلاء کی تعداد حسبِ ذیل ہے :

- تخصص فی علوم النصوص الشرعیہ : ۵ — تخصص فی الفقہ والافتاء : ۱۵
- تکمیل تفسیر : ۷ — تکمیل حدیث : ۸
- تکمیل افتاء : ۵۲ — تربیت تحقیق وتالیف : ۷
- مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ : ۹ — شعبۂ دعوہ ولغہ : ۵

● معہد کے ذریعہ اب تک اُردو، عربی اور انگریزی میں ۸۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں زیادہ تر کتابیں 'کتب خانہ نعیمیہ دیوبند' کے واسطہ سے شائع ہوئی ہیں اور کچھ کتابیں معہد نے خود طبع کی ہیں، اس سال معہد سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ''جدید مالیاتی ادارے — فقہ اسلامی کی روشنی میں'' (صفحات: ۱۰۴)، نیز معہد کے رکن مجلس انتظامی جناب اقبال احمد انجینئر کی تالیف ''عقیدۂ توحید — بائبل اور قرآن مجید کی روشنی میں'' (صفحات: ۲۰۰) طبع ہوئی، یہ دونوں کتابیں نصابی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہیں، اول الذکر کتاب ان محاضرات کی تلخیص ہے جو اقتصادِ اسلامی کے موضوع پر تخصص فی الفقہ سال دوم کے طلبہ کے درمیان دیئے گئے اور ثانی الذکر

تالیف وہ محاضرات ہیں جو مؤلف نے دعوتی نقطۂ نظر سے دیئے ہیں۔

● معہد میں سالِ دوم کے قیام کے دوران فضلاء نے جو مقالات لکھے ہیں، اس سال ان میں سے چھ مقالات طبع ہوئے: ☆ ''اسلام میں تشبہ کے احکام'' (صفحات: ۲۲۲) تالیف: مولوی نور الاسلام اشاعتی، ☆ ''نومسلموں سے متعلق شرعی احکام'' (صفحات: ۳۵۶) تالیف: مولوی محمد عاشق صدیقی ندوی، ☆ ''مروجہ تفریحات اور اسلامی تعلیمات'' (صفحات: ۳۳۶) تالیف: مولوی سید ارشد ملی، ☆ ''حجاب اور اس کی شرعی حیثیت'' (صفحات: ۲۵۲) تالیف: مولوی سرفراز الرب مجاہد قاسمی، ☆ ''**المسائل التی انفرد بها الإمام أبو حنيفة عن الصاحبين**'' (صفحات: ۵۲۰) تالیف: مولوی اسرار احمد ندوی، ☆ مقاصدِ شریعت اور جدید مسائل کے حل میں ان کی اہمیت'' (صفحات: ۱۱۲) تالیف: مولوی محمد ذاکر فلاحی ـــــ نیز ۲۰۱۲ء کے کیلنڈر کی اشاعت بھی عمل میں آئی ہے۔

● ۲۷ رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۷/ جون ۲۰۱۳ء کو حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اپنے بعض متعلق کے ساتھ حرمین شریفین کے سفر پر گئے اور عمرہ کی سعادت حاصل کر کے ۱۴/ شعبان ۱۴۳۴ھ کو واپس ہوئے ـــــ شعبان کے دوسرے ہفتے میں معہد میں معمول کے مطابق سالانہ امتحان منعقد ہوا اور ۲۰/ شعبان سے تعطیل ہوگئی۔

● ۱۹-۲۰/ شعبان ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۹-۳۰/ جون ۲۰۱۳ء کو امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ کے زیر انتظام جھارکھنڈ کے صنعتی شہر جمشید پور میں دو روزہ اجلاس منعقد ہوا، ۲۹/ جون کو قضاء سے متعلق بعض مسائل پر بحث ہوئی، جس میں پورے ہندوستان سے قضاۃ نے شرکت کی، ۳۰/ جون کو تفہیم شریعت کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں علماء اور وکلاء کی بڑی تعداد شریک ہوئی اور ۳۰/ جون کی شب کو شہر کے ایک بڑے میدان میں تعمیر ملت کے عنوان پر عوامی اجلاس ہوا، ان تینوں پروگراموں میں مولانا رحمانی نے کلیدی خطاب فرمایا۔

● ۲۷/ شعبان ۱۴۳۴ھ، مطابق ۷/ جولائی ۲۰۱۳ء بنگلور میں واقع ایک اسلامی مالیاتی ادارہ ''رہبر'' کی جانب سے بنگلور کے دار السلام میں زکوٰۃ کے موضوع پر مولانا رحمانی کا خطبہ ہوا اور اس پروگرام میں تجار اور علماء کی مناسب تعداد نے شرکت کی، آپ اس ادارے کے شرعی ایڈوائزر بھی ہیں۔

● رمضان المبارک میں مختلف اساتذہ مفتی اشرف علی قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محمد اعظم ندوی، مولانا احسان الحق مظاہری، مولانا سرفراز احمد قاسمی، مولانا محبوب عالم قاسمی اور مولانا سرفراز مظاہری وغیرہ نے شہر اور مختلف علاقوں کے دورے کئے اور دعوتی و اصلاحی نقطۂ نظر سے لوگوں کی رہنمائی کی، اسی طرح مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی اور مولانا شوکت ثناء قاسمی نے مصنف ٹی وی کے ذریعہ شرعی مسائل سے متعلق سوالات کے جواب دیئے۔

● ۱۱/ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۱/ جولائی ۲۰۱۳ء کو مسجد سلمٰی پدما نابھا نگر (حیدرآباد) میں بعد نماز ظہر اسلام کا تصور انفاق اور زکوٰۃ کے موضوع پر مولانا رحمانی کا خطاب ہوا، معہد کے اہم معاون جناب اخلاق الرحمٰن صاحب اس کے داعی تھے۔

● ادھر کئی سالوں سے جین کمیونٹی کی ایک سیکولر نمائندہ شخصیت کی جانب سے راجدھانی ہوٹل میں افطار کا اہتمام ہوتا ہے، اس میں شہر کی منتخب مسلمان شخصیات کے ساتھ ساتھ برادرانِ وطن بھی شریک ہوتے ہیں، جناب بشارت علی انجینئر کی خواہش پر ۱۸ ر رمضان المبارک کو دعوتِ افطار سے پہلے اس مجمع سے ''قرآن کا پیغام انسانیت کے نام'' کے عنوان سے مولانا رحمانی نے خطاب کیا۔

● ۱۱ رشوال ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۹ راگست ۲۰۱۳ء کو معہد کھل گیا اور اس سال شعبۂ تخصصات میں سو سے زیادہ اور مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ (مختصر مدتی عالم کورس) میں ۶۸ طلبہ کے داخلے منظور کئے گئے۔

● ۱۴ رشوال ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۲ راگست کو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی عاملہ کا دہلی میں خصوصی اجلاس منعقد ہوا، جس میں مولانا رحمانی نے شرکت کی۔

● ۲۳ رشوال ۱۴۳۴ھ، مطابق: ۱۳۱ اگست کو دہلی میں منعقد ہونے والے ''قضایا فقہیہ معاصرۃ'' ورکشاپ میں مولانا رحمانی نے کلیدی خطبہ دیا، اس ورکشاپ میں معہد کی جانب سے مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی اور مولانا محمد اعظم ندوی نے شرکت کی، یہ چار روزہ اہم اور مفید ورکشاپ جامعہ الامام ریاض کے تعاون اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی میزبانی کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔

● ۲۴ رشوال ۱۴۳۴ھ، مطابق یکم ستمبر کو آئی او ایس دہلی کی جنرل باڈی کی میٹنگ ہوئی، جس میں بحیثیت رکن مولانا رحمانی نے بھی شرکت کی اور اپنے مشورے پیش کئے۔

● الحق ایجوکیشنل سوسائٹی حیدرآباد دیہات وقریہ جات میں بچوں اور بچیوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام کرتی ہے، اس کا مرکز حیدرآباد سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر سنگاپور میں بنایا گیا ہے، یہاں پہلی بار طالبات کے لئے دورۂ حدیث شروع ہوا ہے، ۲۸ رشوال، مطابق ۵ رستمبر کو اس سلسلے میں بڑا جلسہ رکھا گیا تھا، اربابِ ادارہ کی خواہش پر مولانا رحمانی نے بخاری کی پہلی حدیث کا درس دے کر اس سلسلے کا آغاز کیا۔

● ۶ رذوالقعدہ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۳ رستمبر ۲۰۱۳ء کو بعد نماز مغرب مولانا رحمانی نے قرآن فاؤنڈیشن میں ان مردوں اور عورتوں سے خطاب کیا، جو یہاں ترجمۂ قرآن کی کلاس میں شریک ہیں اور قرآن مجید کی تعلیم وتعلم کے سلسلے میں مفید مشورے دیئے۔

● ۸ رذوالقعدہ، مطابق ۱۵ رستمبر کو مدرسہ تعلیم البنات نظام آباد شاخ جامعہ عائشہ نسوان حیدرآباد کا مولانا رحمانی، حافظ خواجہ نذیر الدین سبیلی اور جناب میر مقبول علی ہاشمی، نیز مولانا محمد کلیم مسعودی نے سفر کیا، وہاں کے تعلیمی نظام کا معائنہ کیا اور عوام سے خطاب بھی کیا۔

○ ○ ○